Cont

Cont by AN

Rainaiyaan

Rehaaian

Bait .   بیت :

رعنائیاں

شکیل بدایونی
بی اے (علیگ)

مکتبہ جدید
لاہور

قیمت: تین روپے آٹھ آنے (۸/۳)

فہرست

کب تک شکیل دل کو دغا دیجئے گا آپ

نیاز و ناز کی یہ شان زیبائی نہیں جاتی

جلووں کے تسلط سے مجھے ہوش نہیں ہے

مرا پا آرزو بن کر تصور آشنا ہو کر

سرنگوں کر ہی دیا ذوقِ جبیں سائی نے

افسردہ نہ ہوجائے نگہ نازِ محبت

دل ہی سوزِ دروں سے جل جاتا

ہم خوشی سے جو تیرا غم سہتے

اب تک ہے وہی عشقِ فسوں ساز کا عالم

یہ تو آساں ہے کہ عرضِ غم پنہاں ہو جائے

باعثِ ننگ محبت کی پذیرائی ہے

دل مرکزِ حجاب نہ بنایا جائے گا

پیہم تلاشِ دوست میں کرتا چلا گیا

یوں ارتباطِ شادی و غم دیکھتے رہے

دل میں کسی خلش کا گذر چاہتا ہوں میں

بدمست ہر کے لئے نگہ ناز دیکھنا

عکسِ جمالِ یار ہوا جا رہا ہوں میں

شکوہ ترے حضور کئے جا رہا ہوں میں

نظارۂ جمال سے جنت ہے زندگی

ہم ہیں اور ان کی خوشی ہے آج کل

وارفتگی میں جنسِ محبت خریدلی

خوشا وہ دور کہ جب فکرِ در کار نہ تھی

ہر ایک شے پہ تصرف تھا دیدۂ دل کا

موسم خوشگوار کی راتیں

وہ حیات آفریں نظر افروز

عبرت آموزِ محبت یوں ہوا جاتا ہے دل

آ گئی ہیں رحمتیں پھر جوش میں

منزل کی دھن میں ہوش و خبر سے گذر گئے

رازِ الفت عیاں ہے کیا کہیئے

شکوۂ اضطراب کون کرے

مجھ سے خفا خفا بھی ہیں اور غم برہمی بھی ہے

پھر اٹھی دل میں اک موجِ شباب آہستہ آہستہ

الٰہی کیا وہی ہے حاصل تقدیر انسانی

رنگ صنم کدہ جو ذرا یاد آ گیا

قید قفس میں مژدۂ بہار کیا

ہم ان کی انجمن کا سماں بن کے رہ گئے

جز نغمۂ رباب وفا اور کچھ نہیں

قصر ویراں ہوا جاتا ہے

کام آ ہی جائیگی سعی رائگاں اک دن

حسن و عشق کی منزل اور ہم ارے توبہ

دل لذتِ نگاہ کرم پا کے رہ گیا

کشمکش حیات کو جزوِ حیات پا کے ہم

زندگی ان کی چاہ میں گذری

عالم نہ پوچھئے جو ہمارا ہے آج کل

خوفِ حرم نہ دیر کی گہرائیوں میں ہے

نظر کوئی فردوس نظر ڈھونڈھ رہا ہوں

جو ہے رائگاں تری جستجو یہ مری نظر کی خطا نہیں

تعین پردوں سے تھے نمایاں مکیں کے جلوے مکاں سے پہلے

غم عاشقی کے نظام اور بھی ہیں
رو تصور میں کھونے والے شب الم ساز گار سمجھے
نگاہ ناز کا اک وار کر کے چھوڑ دیا
شاید آغاز ہوا پھر کسی افسانے کا
جفاؤں پر ملال آتا تو ہوگا
لمحہ لمحہ بار ہے تیرے بغیر
ہر نفس عزم و خطا کوشی بروئے کار تھا
وہ دل میں رہتے ہیں دل کا لشان نہیں معلوم
ذکر جفا کئے بغیر اب نہ قرار آئیگا
میرے ہی غم کی ترجماں فطرت بے زباں نہ ہو
تری نظر کو میرے دل سے واسطہ نہ رہا
جنوں سے گذرنے کو جی چاہتا ہے
ابتک جو چھپایا تھا تونے اپنی ہی نظر کے پردے میں
ہم سے دور ہوتے جا رہے ہیں
رنگ بدل کے رہ گیا گلشن روزگار بھی
وہ ایک تیر خراش آگیں جو دل سے نکلیگا آہ بنکر
رعنائی بہار گلستاں گئی
تری یاد سے دل فروزاں کرینگے
شکست شیشۂ عقل و شعور دیکھیں گے
جلوۂ معتبر کو کیا کہئے
زندگی مدہوش ہو کر رہ گئی
ہر مسرت سے گریزاں نظر آتا ہے
ان کو شرح غم سنائی جائے گی
حسن پابند رہ و رسم وفا کیوں نہ رہا

محبت نے ہمیں پہنچا دیا یہ کن منازل میں
تمہید ستم اور ہے تکمیل جفا اور
یہ کیا طلسم غم کدۂ کائنات ہے
انداز مدادائے جنوں کام نہ آیا
تغافل بھی بے مہریاں بھی جفا بھی
تکمیل شباب چاہتا ہوں
آنکھ سے آنکھ ملاتا ہے کوئی
مری زندگی پہ نہ مسکرا مجھے زندگی کا الم نہیں
ستم کی ہر ادا اب تک تو ہمدوش قیامت ہے
دیتی ہیں بہاریں انہیں پیغام سکوں کیا
بن جائے قہر عشرت پیہم کبھی کبھی
اب تو ہر عنوانِ عیش و غم سے جی گھبرا گیا
دل کی نظر سے اہل نظر دیکھتے نہیں
تھا دل کو سکوں عشق جنوں گیر سے پہلے
دور ہیں وہ اور کتنی دور
میری دیوانگی نہیں جاتی
تصور میں ان سے ملاقات کیوں ہو
مری زندگی ہے ظالم ترے غم سے آشکارا
آنکھ ان کو دیکھتی ہے نظارا کئے بغیر
دیدہ کے حوصلے ہیں گم جلوۂ حسن ذات میں
فزوں اتنا تو ذوق جستجوئے یار ہو جائے
وہ تجدید محبت کے لئے بیتاب ہیں اے دل
نہ اب وہ آنکھوں میں برہمی ہے نہ اب وہ ماتھے پہ بل رہا ہے
غم حیات بھی آغوش حسن یار میں ہے

انتساب

بنام

والد محترم حضرت مولانا ابوالجمال مولوی جمیل احمد سوختہ

قادری بدایونی مرحوم

مقام و تاریخ وفات :- بمبئی - ۳۰ جولائی ۱۹۳۹ء

میں تنہا جن کی یادگار ہوں

شکیلؔ بدایونی

بمبئی ستمبر ۱۹۵۰ء

مقدمہ

(از رئیس المتغزلین حضرت جگر مراد آبادی مدظلہ)

شکیل کو میں ان کے زمانہ حصولِ تعلیم سے جانتا ہوں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے متعلم تھے۔ میری رندی و سرمستی کا شباب تھا۔ ہر چیز نذرِ ساغر۔ یہاں تک کہ اس زمانہ کے بے شمار واقعات کا تصور تک اب نہیں آتا۔ تاوقتیکہ بعض احباب انہیں خود بیان کر کے ان کی بار بار تصدیق بھی نہ کرتے جائیں۔ بُرا شعر سُن نہیں سکتا تھا۔ اکثر وہ بیشتر مشاعروں میں اس طرح کے عجیب و غریب مظاہرات ہوتے رہتے ہیں۔ شعرا بہت "محتاط" بن جاتے تھے اور مشاعرے بہت ہی مختصر۔ شکیل بہ حیثیت شاعر ابتدائی دور سے گذر رہے تھے۔ تاہم ان کے کلام نے مجھے اپنی جانب کھینچا۔ اگرچہ کلام میں خامیاں بھی ہوں گی لیکن شعریت اور شعریت کے ساتھ

ساتھ سلاستِ بیان بدرجہ اتم موجود تھی ۔ میرے لئے ہمیشہ شعر میں اولین و آخرین کشش انفرادیت کے ساتھ ساتھ صرف شعر کی باطنی لطافت و پاکیزگی شعریت و نغمگی رہتی ہے سنتے وقت معمولی معمولی سی لفظی خامیوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔ بشرطیکہ شعر کا باطنی رُخ نہایت درجہ حسین و جمیل ہو۔ شکیلؔ کے ابتدائی کلام میں بھی کم و بیش یہ تمام خصوصیات یا ان خصوصیات کے متعلق نمایاں طور پر آثار پائے جاتے تھے ۔

شکیلؔ نظرتاً صالح استعداد شعری اور پاکیزہ مزاج رکھتے ہیں ۔ ان کے کلام میں تنہا شعریت ہی نہیں بلکہ خود ان کی زندگی بھی ہے ۔ وہ ہمیشہ متبسم نظر آتے ہیں۔ اور ماحول کو مسرور دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ کس کو خبر ہے کہ ان کی مسرور زندگی ہے یا زخم ہائے پنہاں کا حجاب لطیف ۔ دورِ حاضر ہی میں نہیں بلکہ ہمیشہ سے شاعر فطرت اور "شاعر کاریگر" دونوں ساتھ ساتھ رہے ہیں ۔ صرف ہیئتیں بدلتی رہتی ہیں ۔

شکیلؔ شاعرِ فطرت ہیں ۔ شاعر کاریگر نہیں ۔ ان کا کلام محض لفظی طلسم بندیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ حقیقتاً ان کا کلام ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے ۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ اب بھی اُن کے کلام میں زبان کی کمزوریاں پائی جاتی ہیں اور شاذ و نادر معنوی اسقام بھی ۔ لیکن شکیلؔ بہر حال انسان ہیں فرشتہ نہیں ۔ خوش مذاقی کا تقاضہ یہ نہیں کہ عیوب ہی پر نظر پڑے ۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ محاسن غالب ہیں یا معائب ؟ میرے نزدیک شکیلؔ کے کلام میں محاسن بدرجہ اتم موجود ہیں ۔

زبان کے متعلق عمومی میرا نظریہ یہ ہے کہ میں " زبان کو لباس اور معنویت " کو

محبوب تصور کرتا ہوں اور میرے نزدیک حسین وہی ہے جو پھٹا پرانا، میلا، کچیلا لباس پہن کر خود لباس کو بھی حسین بنا دے۔ نہ یہ کہ خود محتاج زیبائش و آرائش ہو۔ شکیل کے کلام میں اگر زبان کی چند خامیاں پائی بھی جاسکتی ہیں تو اکثر و بیشتر اسی طرح کی اور کم تر ایسی بھی جنہیں حقیقتاً خامیاں کہا جا سکتا ہے اور جو مقتضائے بشریت بھی ہیں۔

شکیل اگرچہ آج بھی "شعر و ادب" میں بلند اور منفرد درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین کامل ہے کہ اگر وہ باخبرانہ مراحل زندگی طے کرتے رہے تو مستقبل قریب میں ایک خاص شخصیت اور انفرادیت کے مالک بن جائیں گے۔ اور تاریخ ادب میں ان کی ذات غیر فانی بن کر رہے گی۔

میرا یہ عالم ہے کہ فطرتاً معیاری قسم کا کاہل انسان واقع ہوا ہوں۔ اور ضرورتاً انتہائی مصروف زندگی بسر کرنے پر مجبور۔ ورنہ کلام شکیل کے محاسن تفصیلی طور پر پیش کرتا۔ صرف چند اشعار "مشتے نمونہ از خروارے" پیش کئے دیتا ہوں۔ اس طرح کے چند اشعار بھی اگر کوئی شخص زندگی بھر میں کہہ دے تو میں اُسے صحیح معنوں میں شاعر تسلیم کرنے کو تیار ہوں۔

شگفتگی دل کارواں کو کیا سمجھے	وہ اک نگاہ جو الجھی ہوئی غبار میں ہے
یہ اظہار تقدس، چھپکے یہ میخواریاں واعظ	تجھے منجملۂ ارباب فن کہنا ہی پڑتا ہے
دل غم جاناں سے لذت آشنا ہونیکو ہے	کافرانہ زندگی ابتدا ہونے کو ہے
فریب وعدۂ فردا کو جانتا ہوں مگر	میں کیا کروں اگر آجائے اعتبار مجھے

ہزار ترکِ وفا کروں میں تری محبت کو کیا کروں میں
دلِ حزیں تجھ سے روٹھ کر بھی ترے اشارہ پہ چل رہا ہے

محبت کی وہ منزل بھی عجب نازک سی منزل ہے
جہاں اندازۂ لطف وستم دشوار ہو جائے

جاتے ہیں دل میں چھوڑ کے وہ جلوۂ خیال
بجھتی ہے شمع گھر میں اندھیرا کئے بغیر

اکثر تو دل گرفتگیٔ شوق کی قسم!
مجھ تک وہ آ گئے ہیں ارادہ کئے بغیر

وہ اگر بُرا نہ مانیں تو جہانِ رنگ و بو میں
میں سکونِ دل کی خاطر کوئی ڈھونڈ لوں سہارا

میں بتاؤں فرق ناصح جو ہے مجھ میں اور تجھ میں
مری زندگی تلاطم تری زندگی کنارا!

قسم فریبِ نگاہ و دل کی ہمیں تو اس جستجو نے کھویا
وہیں تھی دراصل اپنی منزل قدم اٹھے تھے جہاں سے پہلے

ناصح نظر شناس نہیں ہم تو کیا ملال
جو دل کو دیکھتے ہیں نظر دیکھتے نہیں

ہاں تیری خوشی میری خوشی ہے مگر اے دوست
اس لطفِ مسلسل کا بھی شکوہ نہ کروں کیا؟

لمحات یادِ دوست کو صرفِ دعا نہ کر
آتے ہیں زندگی میں یہ عالم کبھی کبھی!

زاہد کی میکشی پہ تعجب نہ کیجئے
لاتی ہے رنگ فطرتِ آدم کبھی کبھی!

عرضِ مصنّف

میری غزلوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۴۴ء میں رعنائیاں کے نام سے کتب خانہ عزیزیہ دہلی کے مالک مولوی سمیع اللہ صاحب نے شائع کیا تھا۔ چونکہ وہ میرے ابتدائی دورِ شاعری کا مجموعہ تھا۔ اس لئے مجھے اس کی طباعت کے سلسلہ میں کوئی تجربہ نہ تھا۔ لہذا میں نے اس کی تمام تر ذمہ داری مولوی صاحب موصوف کو سونپ دی تھی جنہوں نے اپنی حیثیت اور صلاحیت کے مطابق اس کو طبع فرمایا۔ پہلا ایڈیشن تھا اس لئے بہت کم تعداد میں شائع ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو تین سال ہی میں اسٹاک ختم ہو گیا۔

۱۹۴۶ء میں بمبئی آکر فلمی دنیا میں شامل ہو گیا۔ فلمی زندگی کے ساتھ ساتھ میرے کلام کی مانگ بڑھنے لگی۔ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے پبلشرز نے "رعنائیاں" کا دوسرا ایڈیشن چھاپنے کے لئے میری منظوری حاصل کرنا چاہی مگر مصلحت وقت کی بنا پر میں نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا اور بمبئی آکر صرف ایک نعتیہ مجموعہ کلام "نغمہ فردوس" کے نام سے مکتبۂ سلطانیہ کی وساطت سے شائع کیا۔ آخر کار

اس سال یعنی ۱۹۵۰ء میں سیفی فقیہہ برادران مالکان تاج آفس بک ڈپو "رعنائیاں" کی طباعت کے لئے میری منظوری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مجھے امید ہے کہ سیفی فقیہہ برادرز رعنائیاں کے دوسرے ایڈیشن کو پہلے ایڈیشن سے زیادہ دیدہ زیب بنا کر پیش کرینگے۔

اپنے مذاق شعری کے متعلق پہلے ایڈیشن میں اظہار خیال کر چکا ہوں۔ اس لئے اس عنوان کو دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتا۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں۔ کہ غزل گوئی سے مجھے فطری رغبت ہے اور غزل کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے اور چونکہ اس مجموعہ میں جو غزلیات شامل ہیں۔ ان کا تعلق میرے ابتدائی دور شاعری سے ہے۔ اس لئے میں اس پیش کش پر فخر نہیں کر سکتا۔ بہر حال جو بھی کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔

فقط
شکیل بدایونی

بسم اللہ الرحمن الرحیم ٥

حمد

یہ زمیں آسماں ترے صدقے
میں ہی کیا، دو جہاں ترے صدقے

ہر نفس ہر خیال تجھ پہ نثار
ہر نظر ہر زباں ترے صدقے

خلوتِ حُسن شش جہت کی قسم
بزمِ کون و مکاں ترے صدقے

ہے قیامت کا انتظار ہنوز
دل کی بے تابیاں ترے صدقے

نقش ہے لوحِ دل پہ تیرا کلام
رحمتِ جاوداں ترے صدقے

حور و جنّ و ملک کو کیا کہئے
ابنِ آدم کی جاں ترے صدقے

رنگ و بُو میں اُلجھ سکا نہ شکیل
جلوۂ لامکاں ترے صدقے

نعت

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی)

موت ہی نہ آ جائے کاش ایسے جینے سے
عاشق نبیؐ ہو کر دور ہوں مدینے سے

فرقتِ محمدؐ میں خوں فشاں ہیں یوں آنکھیں
جیسے مے چھلکتی ہو سُرخ آبگینے سے

زندگی کے طوفاں میں جبکہ ناخدا تم ہو
کیوں نہ ہوں خدا والے مطمئن سفینے سے

کون سی دُعا ہے وہ جو اثر نہیں رکھتی
ہاں مگر یہ لازم ہے مانگئے قرینے سے

اے حبیبِ بطحا سُن ہے یہی خوشی میری
عمر بھر لگا رکھوں تیرے غم کو سینے سے

آنکھ بند کرتے ہی ہم تو اے شکیل اکثر
چل دیئے مدینے کو آگئے مدینے سے

۷۸۶

انتخابِ کلام

سنہ ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۴ء

لا رہا ہے مے کوئی شیشے میں بھر کے سامنے
کس قدر پُر کیف منظر ہے نظر کے سامنے

الاماں ذوقِ تماشہ کی کرشمہ کاریاں
کچھ نہیں ہے اور سب کچھ ہے نظر کے سامنے

میں تو اس عالم کو کیا سے کیا بنا دیتا مگر
کس کی چلتی ہے حیاتِ مختصر کے سامنے

پھر نہ دینا طعنۂ ناکامیِ ذوقِ نظر
حوصلہ ہے کچھ تو آ جاؤ نظر کے سامنے

آہ یہ رودادِ ہنگامِ طرب اے غم گسار

ذکرِ گلشن جیسے اک بے بال و پر کے سامنے

ہو چکا جب خاتمہ ساری امیدوں کا تو پھر
جا رہے ہو کیوں شکیلؔ اس فتنہ گر کے سامنے

نظر سے قیدِ تعیّن اٹھائی جاتی ہے
تجلّیِ رُخِ جاناں دکھائی جاتی ہے

جب اُن کو حوصلۂ دل پہ اعتبار نہیں
تو پھر نظر سے نظر کیوں ملائی جاتی ہے

خم و سبو کی ضرورت کے ہم نہیں قائل
شرابِ مست نظر سے پلائی جاتی ہے

ستم نوازیِ پیہم ہے عشق کی فطرت
فضول حُسن پہ تہمت لگائی جاتی ہے

بھلا دیا تھا غمِ روزگار نے جس کو
وہ داستاں مجھے پھر یاد آئی جاتی ہے

شکیلؔ دوریِ منزل سے نا اُمید نہ ہو
اب آئی جاتی ہے منزل اب آئی جاتی ہے

جل کے اپنی آگ میں خود صورتِ پروانہ ہم
بن گئے ہم رشتۂ خاکِ درِ جانانہ ہم

دیکھیے کس راہ لے جائے سکوں کی جستجو
چل تو نکلے ہیں بہ یک اندازِ بے تابانہ ہم

حالِ دل، احوالِ غم، شرحِ تمنا، عرضِ شوق
بے خودی میں کہہ گئے افسانہ در افسانہ ہم

پارسائی خندہ زن وعدہ خلافی طعنہ ریز
ہائے کس مشکل سے پہنچے تا درِ میخانہ ہم

فرصت یک لمحہ دے دیتی جو فکرِ روزگار
یاد کر لیتے کوئی بھولا ہوا افسانہ ہم

جب جفا و جور بھی جز و محبت ہیں شکیل
کس لئے رہتے جفا و جور سے بیگانہ ہم

وجہِ قدر و قیمتِ دل حسن کی تنویر ہے
ورنہ اک ٹوٹے ہوئے شیشے کی کیا توقیر ہے

کچھ تبسم زیرِ لب، پر شرم دامنگیر ہے

اُف یہ کس عالم میں کھچوائی ہوئی تصویر ہے
اک نظر دیکھا جسے مدہوش و بے خود کر دیا
تیری کیف آگیں نگاہوں میں عجب تاثیر ہے
کتنی دلکش ہیں تری تصویر کی رعنائیاں
لیکن اے پردہ نشیں تصویر پھر تصویر ہے
پھونک دے برق تپاں میرا قفس بھی پھونک دے
آشیاں کی یہ بھی اک بگڑی ہوئی تصویر ہے
لن ترانی کہہ دیا تھا طور پر جس نے شکیلؔ
ذرّے ذرّے میں اسی کے حسن کی تنویر ہے

سامنے ہے صنم کدہ سوئے حرم نظر بھی ہے
ذوقِ سجود مرحبا سر بھی ہے سنگِ در بھی ہے
تابشِ حسن خود نما اُف یہ نظر فریبیاں
بزم سے خود نہاں بھی ہے بزم میں جلوہ گر بھی ہے
اب بھی وہ برقِ طور سوز ہے اسی طرح دل فروز
دور بھی ہر نظر سے ہے جنت ہر نظر بھی ہے

ظلمتِ عالمِ فراق، جلوۂ حسنِ بے مثال
بزمِ تصوّرات میں شام بھی ہے سحر بھی ہے

نالہ و آہ پے بہ پے اے دلِ زار تا بہ کے
جس کا تجھے خیال ہے اس کو تری خبر بھی ہے

مجھ کو ساقی نے جو رخصت کیا میخانے سے
خود مے ناب چھلکنے لگی پیمانے سے

دیکھ کر حالتِ دل، ان کو ترس آ ہی گیا
وہ بھی گھبرا سے گئے میرے تڑپ جانے سے

دیتے ہیں طعنۂ اصنام پرستی مجھ کو
سجدہ کرتے ہوئے نکلے ہیں جو بتخانے سے

آپ کے جاتے ہی آباد ہوئی بزمِ خیال
بن گئی اور بھی تقدیر بگڑ جانے سے

محتسب اب تجھے توبہ کا یقین ہو کہ نہ ہو
ہم تو ٹکرا چکے پیمانے کو پیمانے سے

اپنا ہم مسلک و ہم راز کسے کہیئے شکیل!
نظر اس بزم میں سب آتے ہیں بیگانے سے

حقیقتِ غمِ اُلفت چھپا رہا ہوں مَیں
شکستہ دل ہوں مگر مسکرا رہا ہوں مَیں

کمالِ حوصلۂ دل دکھا رہا ہوں مَیں
کسی سے رسمِ محبّت بڑھا رہا ہوں مَیں

بدل دیا ہے محبّت نے ان کا طرزِ عمل
اب اُن میں شانِ تکلّف سی پا رہا ہوں مَیں

مچل مچل کے میں کہتا ہوں "بیٹھئے تو سہی"
سنبھل سنبھل کے وہ کہتے ہیں جا رہا ہوں مَیں

سنی ہوئی سی بس اک دھن ضرور ہے لیکن
یہ خود خبر نہیں کیا گنگنا رہا ہوں مَیں

اب وہ خود محوِ علاجِ دردِ پنہاں ہو گئے
اے خوشا قسمت کے پھر جینے کے ساماں ہو گئے

سوچ تو لیتے کہ آئینے میں کس کا عکس ہے
اِک ذرا سی بات پر اس درجہ حیراں ہو گئے

اللہ اللہ عجلتِ نظارۂ برقِ جمال

وہ نظر آنے نہ پائے تھے کہ پنہاں ہو گئے
میں تو سمجھا تھا کہ یہ بھی اک فریبِ حسن ہے
اُف رہی غیرت وہ تو سچ مچ ہی پشیماں ہو گئے

دیکھئے قابل ہے فیضِ رہ نوردانِ جنوں
خارِ دامن سے اُلجھ کر گلِ بداماں ہو گئے

صدقۂ جاں سوزیٔ فرقت تو مجھ پر بار تھا
میری حالت دیکھ کر تم کیوں پریشاں ہو گئے

کون رکھے گا جہاں میں کفر سامانی کی لاج
عشق میں ہم جیسے کافر جب مسلماں ہو گئے

حضرتِ واعظ جہاں کی لذتوں سے کیوں ہو دور
یہ فرشتہ خصلتی کیسی جب انساں ہو گئے

عہدِ فردا اک بہانہ ہی سہی لیکن شکیل!
اس بہانے سے سکونِ دل کے ساماں ہو گئے

ساقی نظر سے پنہاں شیشے تہی تہی سے
باز آئے ہم تو ایسی بے کیف زندگی سے

کس شوق کس تمنا کس درجہ سادگی سے
ہم آپ کی شکایت کرتے ہیں آپ ہی سے

حُسنِ شگفتہ رُو کی اللہ ری ادائیں
نظریں بھی ہیں مجھی پر پردہ بھی ہے مجھی سے

اے میرے ماہِ کامل پھر آشکار ہو جا
اکتا گئی طبیعت تاروں کی روشنی سے

نالہ کشو اٹھا دو آہ و فغاں کی رسمیں
دو دن کی زندگی ہے کاٹو ہنسی خوشی سے

دامن ہے ٹکڑے ٹکڑے ہونٹوں پہ ہے تبسّم
اِک درس لے رہا ہوں پھولوں کی زندگی سے

آگے خدا ہی جانے انجام عشق کیا ہو!
جب اے شکیلؔ اپنا یہ حال ہے ابھی سے

دل دہی دِل ناشاد کیئے جاتا ہوں
یعنی رہ رہ کے انھیں یاد کیئے جاتا ہوں

سعیٔ ضبطِ غم بیداد کیئے جاتا ہوں

پختہ تر عشق کی بنیاد کئے جاتا ہوں
دل کو وقفِ غم بیداد کئے جاتا ہوں
اپنا گھر آپ ہی برباد کئے جاتا ہوں!

اک وہ ہیں کہ تغافل سے نہیں ان کو گریز
ایک میں ہوں کہ انہیں یاد کئے جاتا ہوں

کیا یہ کم ظلم ہے کچھ غور تو کیجے دل میں
آپ ہنستے ہیں، میں فریاد کئے جاتا ہوں

بھول کر عہد گذشتہ کی حکایات شکیل
دل کو ہر فکر سے آزاد کئے جاتا ہوں

دیدۂ شوق سے نہاں محفل رنگ و بو نہیں
اُس کی نظر نظر کہاں جس کی نظر میں تو نہیں

ہائے وہ مست انکھڑیاں رند کے رُوبرو نہیں
بادہ کشی کا لُطف کیا جام نہیں سبو نہیں

درد میں کچھ کمی نہ ہو یہ تو قبول ہے مگر
طالبِ لطفِ چارہ گر غیرت چارہ جو نہیں

حیرتِ عشق کی قسم ہو گئے ایسے محو ہم
جب تو اِک آرزو بھی تھی، اب کوئی آرزو نہیں

عزمِ سوال کیا کہوں، رعبِ جمال کیا کہوں
حسرتِ گفتگو تو ہے، جراتِ گفتگو نہیں

نالہ کشانِ عشق کی اُف ری اَلم نوازیاں
بیٹھے ہیں ایسے مطمئن جیسے کچھ آرزو نہیں

جانِ بہار ہر نظر عشق کا راز وا نہ کر!
عرضِ شکیلؔ سُن مگر غیر کے روبرو نہیں

آدابِ عاشقی سے بیگانہ کہہ رہی ہے
میری نظر مجھی کو دیوانہ کہہ رہی ہے

ہر آہ سرد پیہم دل سے نکل نکل کر
دل کی تباہیوں کا افسانہ کہہ رہی ہے

اس درجہ ہے مسلط دیوانگی کا عالم
دیوانگی بھی مجھکو دیوانہ کہہ رہی ہے

یہ انقلابِ دوراں یہ عیش و غم کے عنواں

گویا زبانِ فطرت افسانہ کہہ رہی ہے

میری زباں انہیں سے اُن کے ستم کا قصّہ
یوں دب کے کہہ رہی ہے گویا نہ کہہ رہی ہے

اے برقِ فتنہ ساماں عنوانِ تازہ کوئی
یہ کیا سُنا سُنایا افسانہ کہہ رہی ہے

ہوں زندہ اک مرقع میں صورت آفریں کا
دُنیا شکیل میرا افسانہ کہہ رہی ہے

دُنیا کی روایات سے بیگانہ نہیں ہوں
چھیڑو نہ مجھے میں کوئی دیوانہ نہیں ہوں

اس کثرتِ غم پر بھی مجھے حسرتِ غم ہے
جو بھر کے چھلک جائے وہ پیمانہ نہیں ہوں

رودادِ غمِ عشق ہے تازہ مرے دَم سے
عُنوانِ ہر افسانہ ہوں، افسانہ نہیں ہوں

الزامِ جنوں دیں نہ مجھے اہلِ محبّت!
میں خود یہ سمجھتا ہوں کہ دیوانہ نہیں ہوں

میں قائلِ خودداریٔ اُلفت سہی لیکن
آدابِ محبّت سے تو بیگانہ نہیں ہوں

ہے برقِ سرِ طور سے دل شعلہ بداماں
شمعِ سرِ محفل ہوں میں پروانہ نہیں ہوں

ہے گردشِ ساغر مری تقدیر کا چکّر
محتاجِ طوافِ درِ میخانہ نہیں ہوں

کانٹوں سے گزر جاتا ہوں دامن کو بچا کر
پھولوں کی سیاست سے میں بیگانہ نہیں ہوں

لذّت کشِ نظارہ شکیلؔ اپنی نظر ہے!
محرُومِ جمالِ رُخِ جانانہ نہیں ہوں!

کچھ جو انہیں مجھ سے حجاب آگیا
میری اُمیدوں پہ شباب آگیا

آگئی ہونٹوں پہ جنوں کی ہنسی
جب کوئی با حالِ خراب آگیا

تیز خرامیٔ محبّت نہ پوچھ

آنکھ جھپکتے ہی شباب آگیا

عشق کی بیگانہ روی کے نثار
حُسن کو اندازِ عتاب آگیا

اُٹھنے لگی پھر وہ نظر مست مست
دَور میں پھر جام شراب آگیا

دیکھئے تقدیر کا لکھا شکیلؔ!
لیجئے وہ خط کا جواب آگیا

ناکام عرضِ شوق کی جرأت ہے کیا کروں
دل خود ہی پردہ دارِ محبت ہے کیا کروں

شوقِ طوافِ کوئے محبت ہے کیا کروں
ان گردشوں پہ اور یہ حسرت ہے کیا کروں

دل کا بھی کیا قصور تمہاری بھی کیا خطا
برگشتہ مجھ سے خود مری قسمت ہے کیا کروں

تم ہو جفا پسند تو میں ہوں وفا شعار
خوددار اپنی اپنی طبیعت ہے کیا کروں

دیکھوں انہیں تو تابِ نظارہ نہیں مگر
ان کو نہ دیکھنا بھی قیامت ہے کیا کروں

تقدیر ہی سے صرف شکایت نہیں مجھے
تقدیر کو بھی مجھ سے شکایت ہے کیا کروں

گو دل شکن ہیں اُن کی تغافل شعاریاں
اس پر بھی مجھ کو اُن سے محبت ہے کیا کروں

جاتا ہوں روز اُن کی طرف دل بکفِ شکیلؔ
کمبخت آج تک وہی عادت ہے کیا کروں

رازِ وفائے ناز پھر دل کو بتا گیا کوئی
جذبۂ شوق مطمئن راہ پر آگیا کوئی

یُوں تری بزمِ ناز سے اُٹھ کے چلا گیا کوئی
جیسے مُرادِ واقعی عشق میں پا گیا کوئی

سینے میں رُوحِ دردِ دل بن کے سما گیا کوئی
ویسے ہی درد کم نہ تھا اور بڑھا گیا کوئی

شانِ نیاز دیکھنا، شوخیِ ناز دیکھنا

نیّتِ سجدہ جب ہوئی سامنے آگیا کوئی

ختم ہوئی کشاں کشاں فکر و نظر کی داستاں
اب غمِ جستجو کہاں، دل ہی میں آگیا کوئی

لوگ اسے جنوں کہیں یا نہ کہیں مگر شکیلؔ
میں تو کسی کا ہو چکا مجھ میں سما گیا کوئی

مستِ نظارہ بھی کس درجہ تجاہل کوش ہے
یوں نظر آتا ہے جیسے واقعی بے ہوش ہے

خوفِ فردا ہے نہ فکرِ فتنہ ہائے دوش ہے
اب تصوّر میں ترا آغوش ہی آغوش ہے

رفتہ رفتہ بجھتا جاتا ہے چراغِ آرزو
پہلے دل خاموش تھا اب زندگی خاموش ہے

کوئی دیکھے تو ذرا اعجازِ حُسنِ بے اماں
روبرو کا رُوبرو، روپوش کا رُوپوش ہے

جو بھی دل ہے عشق کی نیرنگیوں پر ہے نثار
عشق کا آغوش بھی کیا حُسن کا آغوش ہے

مجھ کو طوفانِ حوادث کی نہیں پروا شکیلؔ
میری ہستی ابتدا ہی سے تلاطم کوش ہے

ابھی جذبۂ شوق کامل نہیں ہے!
کہ بیگانۂ آرزو دل نہیں ہے

کوئی پردۂ راز حائل نہیں ہے
ستم ہے وہ پھر بھی مقابل نہیں ہے

سر آنکھوں پہ نیرنگئ بزمِ عالم
جسے خوفِ غم ہو یہ وہ دل نہیں ہے

مسرت بداماں ہوں سیلابِ غم میں
کوئی موج محرومِ ساحل نہیں ہے

محبت سے بچ کر کہاں جائیے گا
تلاطم ہے آغوشِ ساحل نہیں ہے

وہ کس ناز و انداز سے کہہ رہے ہیں
شکیلؔ اب محبت کے قابل نہیں ہے

اے قافلۂ شوق مرے دل سے گذر جا
منزل کی تمنّا لئے منزل سے گذر جا

پروردۂ طوفاں ہے تو اے موجِ محبت
ساحل بھی جو آجائے تو ساحل سے گذر جا

پھر دیکھ جو ہو کشمکشِ حسن کا عالم
نیچی کیے نظروں کو مقابل سے گذر جا

دل ڈھونڈھ رہا ہے کوئی جاں سوز تجلّی
اے برقِ نظر سینۂ بسمل سے گذر جا

ہر گوشۂ ہستی ہے ابھی درخورِ تعمیر
اک بار پھر اجڑی ہوئی محفل سے گذر جا

ہر گوشۂ نظر میں سمائے ہوئے ہو تم
جیسے کہ میرے سامنے آئے ہوئے ہو تم

میری نگاہِ شوق پہ چھائے ہوئے ہو تم
جلووں کو خود حجاب بنائے ہوئے ہو تم

کیوں اک طرف نگاہ جمائے ہوئے ہو تم

کیا راز ہے جو مجھ سے چھپائے ہوئے ہو تم
دل نے تمہارے حسن کو بخشی ہیں رفعتیں
دل کو مگر نظر سے گرائے ہوئے ہو تم
یہ جو نیازِ عشق کا احساس ہے تمہیں
شاید کسی کے ناز اٹھائے ہوئے ہو تم
یا مہربانیوں ہی کے قابل نہیں ہوں میں
یا واقعی کسی کے سکھائے ہوئے ہو تم
اب امتیازِ پردہ و جلوہ نہیں مجھے
چہرے سے کیوں نقاب اٹھائے ہوئے ہو تم
اُف رے ستم شکیلؔ یہ حالت تو ہو گئی
اب بھی کرم کی آس لگائے ہوئے ہو تم

ہو تو کمال ربطِ محبت کسی کے ساتھ
دل چیز کیا ہے جان بھی دیدو دل خوشی کے ساتھ
ہمدردیاں ہیں عمر کو تنہا روی کے ساتھ
طے کر رہا ہوں راہِ وفا زندگی کے ساتھ

ہے ہر قدم پہ فتنہ در آغوشِ کائنات
ممکن نہیں گذر جو یہاں آشتی کے ساتھ

حاصل ہے اختیار جسے مرگ و زیست پر
جی چاہتا ہے عمر گذاروں اسی کے ساتھ

وہ عشق کیا جو بن کے رہے غیر مستقل
وہ درد کیا جو ختم نہ ہو زندگی کے ساتھ

حاصل ہے اوج سجدہ حریم جمال پر
فطرت میں کچھ غرور بھی ہے عاجزی کے ساتھ

دراصل آدمی نہ سمجھنا اُسے شکیل
جو آدمی وفا نہ کرے آدمی کے ساتھ

یہ کیا ستم ظریفیٔ فطرت ہے آج کل
بیگانگی شریک محبت ہے آج کل

غم ہے کہ ایک تلخ حقیقت ہے آج کل
دل ہے کہ سوگوار محبت ہے آج کل

تنہائی فراق سے گھبرا رہا ہوں میں

میرے لئے سکوں بھی قیامت ہے آج کل
ہر سانس ترجمانِ غمِ دل ہے ان دنوں
ہر آہ پردہ دارِ حکایت ہے آج کل
میری وفا ہی میرے لئے قہر بن گئی
اپنی جفا پہ ان کو ندامت ہے آج کل
پھر چاہتا ہوں اک الم تازہ تشکیل
پھر دل کو جستجوئے مسرّت ہے آج کل

چاندنی میں رُخِ زیبا نہیں دیکھا جاتا
ماہ و خورشید کو یک جا نہیں دیکھا جاتا
یوں تو ان آنکھوں سے کیا کیا نہیں دیکھا جاتا
ہاں مگر اپنا ہی جلوہ نہیں دیکھا جاتا
دیدہ و دل کی تباہی مجھے منظور مگر
ان کا اترا ہوا چہرہ نہیں دیکھا جاتا
ضبطِ غم ہاں وہی اشکوں کا تلاطم اِک بار
اب تو سوکھا ہوا دریا نہیں دیکھا جاتا

زندگی آ تجھے قاتل کے حوالے کر دوں
مجھ سے اب خُون تمنّا نہیں دیکھا جاتا
اب تو جھوٹی بھی تسلّی بسر و چشم قبُول
دل کا رَہ رَہ کے تڑپنا نہیں دیکھا جاتا

نقابِ دیدۂ پُر نور ہو گئے ہو تم
قریب آ کے بہت دُور ہو گئے ہو تم
نگاہ و دل سے اگر دُور ہو گئے ہو تم
نگاہ و دل ہی میں مستور ہو گئے ہو تم
مجھے تو غفلتِ بے جا پہ تھا گمان فریب
یہ کیا خبر تھی کہ مجبور ہو گئے ہو تم
کہاں نیاز محبّت، کہاں وقار جمال
یہ سُن کے خوش ہوں کہ مغرُور ہو گئے ہو تم
مجال دید نگاہوں کو ہے بقدر مذاق
کہیں قریب، کہیں دُور ہو گئے ہو تم
شکیلؔ ترک وفا پر ہے اختیار اگر
تو کس خیال سے مجبُور ہو گئے ہو تم

اب تو خوشی کا غم ہے نہ غم کی خوشی مجھے
بے حس بنا چکی ہے بہت زندگی مجھے

وہ وقت بھی خدا نہ دکھائے کبھی مجھے
اُن کی ندامتوں پہ ہو شرمندگی مجھے

رونے پہ اپنے ان کو بھی افسردہ دیکھ کر
یُوں بن رہا ہوں جیسے اب آئی ہنسی مجھے

یوں دیجئے فریبِ محبت کہ عُمر بھر
میں زندگی کو یاد کروں زندگی مجھے

رکھنا ہے تشنہ کام تو ساقی بس اک نظر
سیراب کر نہ دے مری تشنہ لبی مجھے

پایا ہے سب نے دل مگر اس دل کے باوجود
اِک شے ملی ہے دل میں کھٹکتی ہوئی مجھے

راضی ہوں یا خفا ہوں، وہ جو کچھ بھی ہوں شکیلؔ
ہر حال میں قبول ہے اُن کی خوشی مجھے

میں ان کے ارادوں میں حائل نہیں ہوں
تری بزم سے ہے بس اتنا تعلق!
کہ شامل بھی ہوں اور شامل نہیں ہوں
کرم اور اغیار کے مشوروں سے
میں ایسی عنایت کا قائل نہیں ہوں
سنبھل کر ذرا اے محبت کی کشتی
میں طوفاں ہی طوفاں ہوں ساحل نہیں ہوں
مرا سوزِ ہستی ہے دور از ندامت
میں پروانہ ہوں، شمعِ محفل نہیں ہوں

بیکار گئی آڑ ترے پردۂ در کی
اللہ رے وسعت مرے آغوشِ نظر کی
پی شوق سے واعظ ارے کیا بات ہے ڈر کی
دوزخ ترے قبضہ میں ہے جنت ترے گھر کی
ایمان کی دولت سے ترے حسن کا سودا
ایمان تو دولت ہے تری ایک نظر کی

کاش گلشن میں یوں بہار آئے
جامۂ رنگ و بُو اُتار آئے

تری محفل سے کامگار آئے
بن کے سر تا قدم بہار آئے

داخلِ میکدہ ہیں یوں واعظ
جیسے مسجد میں بادہ خوار آئے

کاش بے اعتباریوں کو مری
تیرے وعدے پہ اعتبار آئے

مختصر داستانِ ہستی میں
تذکرے غم کے بار بار آئے

دل کو اُن سے ہی نسبتیں ہیں شکیل
جب نہ ہوں وہ تو کیوں قرار آئے

فریبِ محبّت سے غافل نہیں ہوں
جو مستِ جنوں ہو وہ دل نہیں ہوں

تمہیں عزمِ ترکِ تعلق مبارک!

آجائے تصوّر میں کوئی حشر بداماں
پھر میری شبِ غم کو ضرورت ہے سحر کی

وہ سامنے ہیں پھر بھی انھیں ڈھونڈھ رہا ہوں
آخر کوئی حد بھی ہو حجاباتِ نظر کی

تنہائیِ فرقت میں جو عالم ہے اِدھر کا
ہنگامۂ محفل میں وہ حالت ہے اِدھر کی

کچھ سہل نہ پائے ہیں محبت کے مراتب
چھانی ہے بہت خاک تری رہگذر کی

اہانتِ دلِ صبر آزما نہیں کرتے
بلند ہم کبھی دستِ دُعا نہیں کرتے

سرِ اہلِ عشق کے اکثر جھکا نہیں کرتے
اگر جھکے بھی کہیں پھر اٹھا نہیں کرتے

وہ بات اُن کی نگاہیں بتائے دیتی ہیں
جسے وہ اپنی زباں سے ادا نہیں کرتے

دلیلِ نالشِ ایماں ہے کفر کا احساس

چراغ شام سے پہلے جلا نہیں کرتے
اُمیدِ عہدِ وفا اور اُن بتوں سے شکیلؔ
جو بھول کر بھی کسی سے وفا نہیں کرتے

راہبر کی نہ فکر منزل کی
کر رہا ہوں میں پیروی دل کی
کھو گیا جستجوئے شوق میں جب
مل گئی مجھ کو راہ منزل کی
آہ نہ آئے نہ اُن کو آنا تھا
آرزو دل میں رہ گئی دل کی
پھر تلاطم میں لے گئیں موجیں
مجھ کو صورت دکھا کے ساحل کی
ترکِ الفت کی کوششیں ہیں فضول
کیا بجھے گی لگی ہوئی دل کی
الاماں پختگیٔ ذوقِ نظر
پست ہیں ہمتیں مقابل کی

پہلو میں دردِ عشق کی دُنیا لئے ہوئے
بیٹھا ہوں زندگی کا سہارا لئے ہوئے

دل ہے تجلّیٔ رُخِ زیبا لئے ہوئے
آغوش میں ہے چاند کو دریا لئے ہوئے

پہونچے تو دل میں جوشِ تمنّا لئے ہوئے
ٹوٹے مگر لُٹی ہوئی دُنیا لئے ہوئے

مَیں جی رہا ہوں غم کدۂ روزگار میں
تیری محبّتوں کا سہارا لئے ہوئے

اُٹھتا ہوں بزمِ حُسن سے لغزش بپا شکیلؔ
بھٹکی سی اِک نظر کا سہارا لئے ہوئے

نمایاں دونوں جانب شانِ فطرت ہوتی جاتی ہے
انہیں مجھ سے مجھے اُن سے محبت ہوتی جاتی ہے

مری شامِ الم صبحِ مسرّت ہوتی جاتی ہے
کہ ہر لحظہ ترے ملنے کی صورت ہوتی جاتی ہے

نگاہیں مضطرب، اُترا ہوا چہرہ، زباں ساکت

جو تھی اپنی وہی اب اُن کی حالت ہوتی جاتی ہے
نہ کیوں ہوں اس ادا پر عشق کی خودداریاں صدقے
اُنہیں رودادِ غم سُن سُن کے حیرت ہوتی جاتی ہے
کہیں رازِ محبت آسماں پر بھی نہ کھُل جائے
مجھے آہ و فغاں کرنے کی عادت ہوتی جاتی ہے
محبت ہی میں ملتے ہیں شکایت کے مزے پیہم
محبت جتنی بڑھتی ہے شکایت ہوتی جاتی ہے
شکیلؔ اُن کی جدائی میں ہے لطفِ زندگی زائل
نظر بے کیف افسردہ طبیعت ہوتی جاتی ہے

نظر محوِ رُخِ پیرِ مغاں معلوم ہوتی ہے
زمینِ میکدہ بھی آسماں معلوم ہوتی ہے
فضا میں جذبِ گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے
زمیں پامال ہو کر آسماں معلوم ہوتی ہے
کمالِ بدگمانی کا یہ عالم اے معاذ اللہ
ذرا سی بات بھی اک داستاں معلوم ہوتی ہے

بہشتِ آرزو ہے لاکھ حسن و عشق کی منزل
مگر جنّت یہ دور از کارواں معلوم ہوتی ہے

مرے دل نے مجھے غربت میں تسکیں دی یہ کہہ کہکر
وہ منزل ہے، وہ گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

فسانہ بن چکی ہوتیں مری بربادیاں اب تک
طبیعت خوگرِ ضبطِ فغاں معلوم ہوتی ہے

تشکیلِ افسانہ ہائے عشق کے عنوان تو دیکھو
یہ میری داستاں، میری زباں معلوم ہوتی ہے

سرگذشتِ دل کو رودادِ جہاں سمجھا تھا میں
مختصر سی بات کو اِک داستاں سمجھا تھا میں

بن گئی میرے لئے اِک اضطرابِ مستقل
جس محبّت کو سکونِ قلب و جاں سمجھا تھا میں

وہ بھی میری گردشِ تقدیر کا اِک دور تھا
جس کو اب تک انقلابِ آسماں سمجھا تھا میں

وہ تو یہ کہئے محبت نے حقیقت کھول دی

زندگی کو ورنہ اِک رازِ نہاں سمجھا تھا میں
رشک رہ رہ کر نہ کیوں آئے نصیبِ غیر پر
وہ اسی محفل میں شامل تھے جہاں سمجھا تھا میں
تھا حرم کی سرزمیں پر لطف اندوزِ سجود
یعنی کعبے کو تمہارا آستاں سمجھا تھا میں
وادیِ غربت میں یوں گم کردہ منزل تھا شکیلؔ
رہزنِ منزل کو خضرِ کارواں سمجھا تھا میں

سکون و صبر کا امیدوار ہے اب تک
نہ جانے کس لئے دل بے قرار ہے اب تک
کسی کے جلوۂ رنگیں کی جاذبیت سے
مرادِ جُود برنگِ بہار ہے اب تک
وہ اپنی وعدہ خلافی پہ ہو گئے نادم
اسی لئے تو مجھے اعتبار ہے اب تک
اُٹھا تھا ایک ہی پردہ ہزار پردوں میں
جہاں میں تذکرۂ حُسنِ یار ہے اب تک

جلے ہوئے مرے دل کو ہوا زمانہ شکیلؔ
کسی کی برقِ نظر شعلہ بار ہے اب تک

کسی کو جب نگاہوں کے مقابل دیکھ لیتا ہوں
تو پہلے سر جھکا کے حالتِ دل دیکھ لیتا ہوں

مآلِ جستجوئے ذوقِ کامل دیکھ لیتا ہوں
اُٹھاتے ہی قدم آثارِ منزل دیکھ لیتا ہوں

میں تجھ سے اور لطفِ خاص کا طالب معاذ اللہ
ستمگر اس بہانے سے ترا دل دیکھ لیتا ہوں

جو موجیں خاص کر چشم و چراغِ دام طوفاں ہیں
میں ان موجوں کو ہم آغوشِ ساحل دیکھ لیتا ہوں

شکیلؔ احساس ہے مجھ کو ہر اک موزوں طبیعت کا
غزل پڑھنے سے پہلے رنگ محفل دیکھ لیتا ہوں

ہنوز دردِ محبت سکوں نواز نہیں
کہ میرے حال سے مایوس چارہ ساز نہیں

خدائے عشق کی بندہ نوازیوں کی قسم
میں بندہ وہ ہوں جسے بندگی پہ ناز نہیں

غم و خوشی تو مآل فریبِ ہستی ہیں
غم و خوشی کا محبّت میں امتیاز نہیں

ہے پھر بھی حسرتِ نظارہ جمال مجھے
یہ جانتا ہوں کہ عمرِ نظر دراز نہیں

کہو کہو یہ محبّت کا لفظ پھر تو کہو
اسے چھپاؤ نہ مجھ سے یہ کوئی راز نہیں

جنونِ عشق مجھے اس مقام پر لے چل
جہاں مجاز و حقیقت میں امتیاز نہیں

مری اک آہ میں مضمر ہے رازِ عشق شکیل!
جو میں کہوں تو مری داستاں دراز نہیں

سر بھی ہے پائے یار بھی شوقِ سوا کو کیا ہوا
جرأتِ دل کدھر گئی لغزشِ پا کو کیا ہوا
حسرتِ عفو کیا ہوئی جرم و خطا کو کیا ہوا

سامنے ہے درِ کرم دستِ دعا کو کیا ہُوا

وقفِ مذاقِ جستجو دیدہ و دل ہیں اب کہاں
منزلِ شوق پا ہی کی غیرت پا کو کیا ہُوا

جذب و اثر سے بن گیا اور بھی دشمن آسماں
کر دیا رازِ دل عیاں آہ رسا کو کیا ہُوا

کل تو بہ حدّ شکوہ تھیں عشق کی بدگمانیاں
اب یہ ندامتیں ہیں کیوں شکوہ سرا کو کیا ہُوا

شاعرِ بزمِ عقل و ہوش ہاں کوئے نغمۂ سروش
دل کی صدا ہے کیوں خموش دل کی صدا کو کیا ہُوا

یُوں تو ہزار نقش ہیں صفحۂ کائنات پر
اس کا پتہ نہیں مگر نقشِ وفا کو کیا ہُوا

گُم شدہ جمال ہوں دل ہی کے ساتھ اے شکیلؔ
مُجھ کو بھی لے کے کھو گیا راہنما کو کیا ہُوا

بے خوف و بے خطر ستم بے پناہ سے
اکثر گذر گیا ہوں محبت کی راہ سے

سرگوشیاں ہیں بزم میں کچھ میری آہ سے
اب راز کھل نہ جائے کہیں اشتباہ سے

زاہد جنون سجدۂ پیہم غلط غلط!
سجدہ وہی ہے سر نہ اُٹھے سجدہ گاہ سے

اقبالِ جُرم شوق نہ کرنا بھی جُرم ہے
عذرِ گناہِ عشق ہے بدتر گناہ سے

دل ترکِ شوق کر نہ سکا اُف یہ کیا ہُوا
میری نگاہ مل گئی ان کی نگاہ سے

منزل کی دُھن میں منّتِ رہبر تو ہو چکی
اَب لیجے مشورہ کِسی گُم کردہ راہ سے

کب تک شکیلؔ دل کو دغا دیجئے گا آپ
بہتر یہی ہے اُن کو بھُلا دیجئے گا آپ

پھر تشنۂ جمال بنا دیجئے گا آپ
رُخ سے نقاب اُلٹ کر گرا دیجئے گا آپ

دل کے عوض تو غم ہی دیا آپ نے مگر

اب جاں بھی نذر کردوں تو کیا دیجیئے گا آپ

ہوتا جبینِ حسن پہ گمنامیوں کا داغ
وہ تو مری نظر کو دعا دیجیئے گا آپ

احساسِ ترکِ شوق بجا ہے مگر شکیلؔ
مانگا جواب دل نے تو کیا دیجیئے گا آپ

نیاز و ناز کی یہ شانِ زیبائی نہیں جاتی
ہماری خودسری، ان کی خودآرائی نہیں جاتی

ہزاروں آئینے ہو کر مقابل ٹوٹ جاتے ہیں
مگر حسنِ ازل کی شانِ یکتائی نہیں جاتی

کوئی دلکش نظارہ ہو کوئی دلچسپ منظر ہو
طبیعت خود بہل جاتی ہے بہلائی نہیں جاتی

محبت کی حقیقت کم نہیں اسرارِ ہستی سے
سمجھ لیتا ہوں لیکن مجھ سے سمجھائی نہیں جاتی

بظاہر ضبطِ پیہم بھی شریکِ دردِ الفت ہے
شکیلؔ اس پر بھی اپنے دل کی رسوائی نہیں جاتی

جلوؤں کے تسلط سے مجھے ہوش نہیں ہے
پردہ تو بھی ہے کہ وہ روپوش نہیں ہے
گو حُسن کی فطرت ہی وفاکوش نہیں ہے
اس پر بھی تو خالی کوئی آغوش نہیں ہے
اللہ رے محبّت میں مری دیدہ دلیری
ہر جُرم پہ کہتا ہوں مجھے ہوش نہیں ہے
کیا جانیئے کیا سُن کے چلا آیا ہے کوئی!
اس طرح کہ آنچل بھی سر دوش نہیں ہے
اُلفت ہے شکیل اب بھی مگر تشنۂ شورش
بادہ ہے مگر بادۂ سرجوش نہیں ہے

سراپا آرزو بن کر تصوّر آشنا ہو کر
رہیں گے ہم انہیں کے روبرو اُن سے جُدا ہو کر
فروغِ جلوہ حیرت اثر میں مبتلا ہو کر
مَیں ان کے روبرو آیا انہیں کا آئینہ ہو کر
نگاہوں کا نہ ملنا قلب کو محسوس ہوتا ہے

کسی کا تیر سیدھا دل پہ آتا ہے خطا ہو کر

ٹھہرنے ہی نہیں دیتا مذاقِ جستجو مجھ کو
گذر جاتا ہوں ہر منزل سے منزل آشنا ہو کر

یہ عشق و وفا میں اختلافِ شوق کیا معنی
پہونچ جائے گی اک مرکز پہ دنیا جابہ جا ہو کر

حریفانِ محبت سرنگوں کیوں ہیں سرِ محفل
اگر کچھ پاسِ غیرت ہے تو اٹھ جائیں خفا ہو کر

سرنگوں کر ہی دیا ذوقِ جبیں سائی نے
نخوتِ عشق مٹادی تری یکتائی نے

ہوش رادراک سے بیگانہ بنا کر اک بار
کوئی کروٹ ہی نہ بدلی تری انگڑائی نے

بن گیا بے خودِ نظارہ بالفاظِ دگر
لاج رکھ لی ترے جلووں کی تماشائی نے

مختصر ایک تو ویسے ہی نہ تھی نیدِ حیات
اور میعاد بڑھادی شبِ تنہائی نے

قدر ہونے لگی اربابِ محبت میں شکیلؔ
مجھ کو انسان بنایا مری رسوائی نے

افسردہ نہ ہو اے نگہ نازِ محبت !
افشا ہوا جاتا ہے ہر اک رازِ محبت

چھیڑا جو نگاہوں نے ذرا سازِ محبت
ہر ذرے سے آنے لگی آوازِ محبت

آگے ہے تعین کی حدوں سے بھی تخیل
ہشیار ہو اے طاقتِ پروازِ محبت

دل مضطربِ شوق، نظر ساکت و خاموش
دیکھے تو کوئی حسن کے اندازِ محبت

وہ لاکھ فریبِ نگہ و دل سہی لیکن
آغازِ محبت ہے پھر آغازِ محبت

تخلیق شکیلؔ اس کی ہے بے مطلب و معنی
جس دل کو نہ ہو جستجوئے رازِ محبت

دل ہی سوزِ دروں سے جل جاتا
کوئی ارمان تو نکل جاتا

ہے جو سب کچھ تو دل نہیں لگتا
کچھ نہ ہوتا تو دل بہل جاتا

ہم خوشی سے جو تیرا غم سہتے
غم کا عنوان ہی بدل جاتا

جل گیا طور کیا کمال ہوا
بات جب تھی نقاب جل جاتا

جنبشِ یک نظر کی حسرت تھی
کوئی گرتا ہوا سنبھل جاتا

دل میں آکر وہ دیکھ تو لیتے
یہ بھی کیا طور تھا جل جاتا

تم نگاہیں چرا چرا لیتے
رنگِ محفل بدل بدل جاتا

اب تک ہے وہی عشق فسوں ساز کا عالم

جیسے کوئی گونجی ہوئی آواز کا عالم
رسوائی کا عالم ہے، کہیں راز کا عالم
دل کش ہے محبت کے ہر انداز کا عالم
احساسِ محبت کی قسم غور تو کیجے
کیا پہلے یہی تھا نگہ ناز کا عالم
جلوت میں سکوتِ دلِ پُر شوق کی دُنیا
خلوت میں خیالات کی پرواز کا عالم
اُٹھنا تھی تشکیلؔ آنکھ نہ اُٹھی سرِ محفل
دیکھا نہ گیا حسنِ خدا ساز کا عالم

یہ تو آساں ہے کہ عرضِ غم پنہاں ہو جائے
اور اگر اپنے گئے پر وہ پشیماں ہو جائے
نامکمل ہے ابھی مرحلۂ رازِ وفا
دُور کچھ اور ذرا منزلِ جاناں ہو جائے
میرے ارماں پہ ذرا سوچ سمجھ کر ہنسئے
میرا ارماں نہ کہیں آپ کا ارماں ہو جائے

تیری نظروں کی یہ سب حوصلہ افزائی ہے
جی رہا ہوں نگہ ناز کی جنبش پہ شکیلؔ
زیست آئینہ اعجازِ مسیحائی ہے

دل مرکزِ حجاب بنایا نہ جائے گا
اُن سے بھی رازِ عشق چھپایا نہ جائے گا
سر کو قدم قدم پہ جھکایا نہ جائیگا
اُن کے نقوشِ پا کو مٹایا نہ جائے گا
بے وجہ انتظار دکھانے سے فائدہ
کہہ دیجئے کہ سامنے آیا نہ جائے گا
آنکھوں میں اشک قلب پریشاں نظر اُداس
اس طرح اُن کو چھوڑ کے جایا نہ جائیگا
وہ خود کہیں تو شرحِ محبت بیاں کروں
نغمہ بغیر ساز سُنایا نہ جائے گا
بہتر یہی ہے ذکرِ محبت نہ چھیڑیے
نقشہ بگڑ گیا تو بنایا نہ جائے گا

زاہدانِ کفر کے جلووں کی قسم تجھ کو معاف
تجھ سے سو بار اگر لغزشِ ایماں ہو جائے
لے تو آیا ہے مقدر سرِ ساحل مجھ کو
اب نہ ساحل بھی کہیں محرمِ طوفاں ہو جائے

اب تو آزادیٔ مجبورِ محبت ہے یہی
زندگی خوگرِ پابندیٔ زنداں ہو جائے
یہ بھی اک صورتِ تسکینِ محبت ہے شکیل
ورنہ دل اور محبت میں پریشاں ہو جائے

باعثِ ننگِ محبت کی پذیرائی ہے
ان کو ہر گام پہ اندیشۂ رسوائی ہے
ہم بھی دیکھیں گے کہاں تک غمِ تنہائی ہے
ہم نے بھی ترکِ محبت کی قسم کھائی ہے
آپ رسوائی کے ڈر سے نہیں ملتے ہیں تو کیا
لیکن اب مل کے نہ ملنے میں بھی رسوائی ہے
جذبۂ عشق کہاں ہستیٔ موہوم کہاں

دل کی طرف شکیلؔ توجہ ضرور ہو
یہ گھر اجڑ گیا تو بسایا نہ جائیگا

پیہم تلاش دوست میں کرتا چلا گیا
کونین کی حدوں سے گزرتا چلا گیا

جتنا مذاق عشق سنورتا چلا گیا
رنگ طبیعت اور نکھرتا چلا گیا

اس سنگدل کی دیدہ دلیری تو دیکھنا
شکووں کا اعتراف بھی کرتا چلا گیا

بے چارگی تو دیکھئے مجبور شوق کی
تہمت مقدرات پہ دھرتا چلا گیا

دیتے رہے فریب مسرت وہ پے بہ پے
میں غم کی منزلوں سے گذرتا چلا گیا

تصویر یاس و غم تھی بظاہر نہاں مگر
ہر نقش دل ہی دل میں ابھرتا چلا گیا

دل محو اضطراب نظر ساکت و خموش
یہ کون سامنے سے گزرتا چلا گیا

یوں ارتباطِ شادی و غم دیکھتے رہے
اُن کی جفا بہ رنگِ کرم دیکھتے رہے

عظمت یہ اپنی عشق میں ہم دیکھتے رہے
عالم تمام زیرِ قدم دیکھتے رہے

کچھ اختلافِ شیخ و برہمن پہ کی نظر
کچھ ماورائے دیر و حرم دیکھتے رہے

تھا جاذبِ نگاہ کچھ اس درجہ حُسنِ یار
اُٹھ بھی گئے وہ بزم سے ہم دیکھتے رہے

تصویرِ عشق آئینۂ حُسن بن گئی
سارا جہاں ہمیں، انہیں ہم دیکھتے رہے

لطفِ نشاطِ صبح ذرا اُن سے پوچھئے
پیہم جو رنگِ شامِ الم دیکھتے رہے

خودداریوں نے سر نہ جھکانے دیا شکیلؔ
حسرت سے اُن کا نقشِ قدم دیکھتے رہے

دل میں کسی خلش کا گذر چاہتا ہوں میں

جیسی بھی ہو بس ایک نظر چاہتا ہوں میں

خم ہو کے پھر نہ اُٹھے وہ سر چاہتا ہوں میں
اُٹھ کر جو خم نہ ہو وہ نظر چاہتا ہوں میں

ہوتے ہی تذکرہ کوئی آجائے رُو برُو
اتنا بلند ذوقِ نظر چاہتا ہوں میں

میرا سکوتِ شوق ہے سب کچھ مرے لئے
نالوں کو بے نیازِ اثر چاہتا ہوں میں

کیا پُوچھتے ہو مقصدِ اظہارِ آرزو
شرحِ وفا پہ نقد و نظر چاہتا ہوں میں

پیہم غمِ فراق سے گھبرا گیا ہے دِل
کچھ امتیازِ شام و سحر چاہتا ہوں میں

جی چاہتا ہے آگ لگا دوں نقاب میں
جلوؤں سے انتقامِ نظر چاہتا ہوں میں

محتاج راہبر ہوں جہاں خضر تک شکیلؔ
ایسی بھی کوئی راہگذر چاہتا ہوں میں

بدمست ہو کے اسے نگہ ناز دیکھنا
پھر میری لغزشوں کے بھی انداز دیکھنا

ترکِ نیاز شوق کا اعجاز دیکھنا
سونی پڑی ہے انجمنِ ناز دیکھنا

سوز و گداز نغمۂ بے ساز دیکھنا
سارا جہاں ہے گوش بر آواز دیکھنا

اُن کی حریم ناز کے پردوں کو چھو لیا
میری نظر کی جرائتِ آغاز دیکھنا

خود بن گیا پیام سکوں جوشِ اضطراب
گھبرا کے کس نے دی مجھے آواز دیکھنا

یوُں دیکھتی ہے جیسے نہیں دیکھتی نظر
ظالم کے دیکھنے کے یہ انداز دیکھنا

بُت خانۂ جمال میں آئے تو ہو شکیلؔ
آساں نہیں ہے حسن خداداد دیکھنا

عکسِ جمال یار ہوا جا رہا ہوُں میں

سر تا قدم بہار ہوا جا رہا ہوں میں
خود حسن خود بہار ہوا جا رہا ہوں میں
فطرت کا شاہکار ہوا جا رہا ہوں میں

جتنا وہ دے رہے ہیں پیامِ سکوں مجھے
اتنا ہی بے قرار ہوا جا رہا ہوں میں

تیرا جمال، تیری محبت، تری نظر
لیکن قصور وار ہوا جا رہا ہوں میں

وہ کہہ رہے ہیں قصۂ بینائیِ فراق
سُن سُن کے بے قرار ہوا جا رہا ہوں میں

بن کر شکیلؔ رازِ سراپائے حسنِ دوست
عالم پہ آشکارا ہوا جا رہا ہوں میں

شکوہ ترے حضور کیے جا رہا ہوں میں
جو کچھ بھی ہو قصور کیے جا رہا ہوں میں

وہم تعینات کا انجام دیکھنا
نزدیکیوں کو دُور کیے جا رہا ہوں میں

محوِ طوافِ کوچۂ ہستی ہیں رحمتیں
شاید کوئی قصور کیئے جا رہا ہوں میں

رکھی ہوئی ہے سنگ درِ یار پر جبیں
اس عجز پر غرور کیئے جا رہا ہوں میں

نذرِ نگاہِ ناز ہیں دل کی نزاکتیں
شیشے کو چور چور کیئے جا رہا ہوں میں

ربطِ نیاز و ناز کا عالم تو دیکھنا
نادم ہیں وہ قصور کیئے جا رہا ہوں میں

سوچا کبھی نہ حضرتِ واعظ نے یہ شکیلؔ
رندوں میں ذکرِ حور کیئے جا رہا ہوں میں

نظارۂ جمال سے جنّت ہے زندگی
وہ رُوبرُو نہیں تو قیامت ہے زندگی

ہر چند ایک زندہ حقیقت ہے زندگی
لیکن بس اِک نگاہ کی قیمت ہے زندگی

جب چاہے پھونک دے مری ہستی کا آشیاں

اِک برقِ بے امان کی امانت ہے زندگی

مُنہ اُن سے موڑ کر نہیں زندگی
نہیں: ٹھکرا دوا، نگاہ جھکانا نہیں قبول
بیگانۂ فریب ندامت ہے زندگی

کتنی لطیف، کتنی حسیں، کتنی مختصر
اِک نوشگفتہ پھول کی نکہت ہے زندگی

اُن کے خیال، اُن کی تمنّا میں مست ہوں
میرے لئے تشکیل عبادت ہے زندگی

ہم ہیں اور ان کی خوشی ہے آج کل
زندگی ہی زندگی ہے آج کل!

غم کا ہر عالم نیا ہے اِن دنوں
دل کی ہر دُنیا نئی ہے آج کل!

اُن کا ذکر اُن کی تمنّا ان کی یاد
وقت کتنا قیمتی ہے آج کل!

چاند بھی ہے سوگوارِ ہجرِ دوست
پھیکی پھیکی چاندنی ہے آج کل!

جل رہی ہے دل میں شمعِ آرزو
غم کدے میں روشنی ہے آج کل

تو ہے اور دریا دلی ہے ساقیا
میں ہوں اور تشنہ لبی ہے آج کل

بے قراری، کروٹوں پر کروٹیں
دل کا عالم دیدنی ہے آج کل

عرضِ غم پر مسکراتے بھی نہیں
برہمی سی برہمی ہے آج کل

حاصلِ ترکِ محبت دیکھنا
انجمن سُونی پڑی ہے آج کل

دل میں اور مایوسیوں میں اے شکیلؔ
اتحادِ باہمی ہے آج کل

وارفتگی میں جنسِ محبت خرید لی
لطفِ سکون مٹا کے قیامت خرید لی

واعظ نہ پوچھ حاصلِ ترغیبِ میکشی

اک جام کے عوض تری جنت خرید لی

دل کو نگاہِ ناز نے اپنا بنا لیا
کچھ شوخیوں نے دل کے متانت خرید لی

یوں کر رہے ہیں شرحِ محبت پہ تبصرہ
جیسے ہمیں نے جنسِ محبت خرید لی

چار آنسوؤں میں وہ کشش و جذب ہی کہاں
لیکن گناہگار نے رحمت خرید لی

خوشا وہ دَور کہ جب فکرِ روزگار نہ تھی
نزاکتِ غمِ دل زندگی پہ بار نہ تھی

ہر ایک لمحہ تھا آسودۂ سکونِ حیات
ملی تھی ایسی طبیعت جو بے قرار نہ تھی

قریب تر تھا ہر اک مدعا بقدرِ طلب
نگاہِ واقفِ تکلیفِ انتظار نہ تھی

دل شگفتہ و نازک تھا فطرتاً آزاد
ہزار شغل تھے فکرِ مآلِ کار نہ تھی

فلک کے جورِ مسلسل پہ اعتماد نہ تھا
زمیں کی گردشِ پیہم بھی ناگوار نہ تھی
نگاہ شاہدِ گلشن ضرور تھی لیکن
فریب خوردۂ رنگینیٔ بہار نہ تھی
ہر ایک شے پہ تصرف تھا دیدہ و دل کا
جہاں میں کشمکشِ جبر و اختیار نہ تھی
جنونِ مشغلۂ آشیانہ سازی تھا
عیاں گرفتگیٔ برقِ شعلہ بار نہ تھی
نہ درد و غم، نہ شکایت، نہ اضطرابِ جنوں
محبتیں تھیں مگر کوئی یادگار نہ تھی
کبھی یہ حال کہ خلوت میں جی نہ لگتا تھا
کبھی یہ رنگ کہ محفل بھی سازگار نہ تھی
حیاتِ عشرتِ ماضی ارے معاذ اللہ
بجا کہوں تو عمارت ہی پائدار نہ تھی
غرض تمام ہوئی اب وہ داستانِ نشاط
حسین خواب سے بڑھ کر جو کامگار نہ تھی

شکیلؔ آہ یہ عالم ہے اب تو ہستی کا
کہ جیسے اپنے چمن میں کبھی بہار نہ تھی

موسمِ خوشگوار کی راتیں
آ گئیں پھر بہار کی راتیں

کیف کی صبح، انبساط کی شام
حسن کے دن نکھار کی راتیں

آہ یہ فصلِ گل یہ رعنائی
اور یہ انتظار کی راتیں

میرے دل سے نہ پوچھئے کیا ہیں
بزمِ ناسازگار کی باتیں

کالی کالی مہیب وحشت ناک
جیسے اک سوگوار کی راتیں

دیکھتی ہیں گھٹائیں ساون کی
دیدۂ اشکبار کی راتیں

بجلیاں بھی ہیں دیکھ کر لرزاں

اُف دل بے قرار کی راتیں
آہ ایسے میں یاد آتی ہیں
وہ سکون و قرار کی راتیں
وہ حیات آفریں نظر افروز
جلوۂ حسن یار کی راتیں
وہ مسرت وہ انبساط کے دن
وہ محبّت وہ پیار کی راتیں
نغمہ ریز و معطّر و مخمور
جیسے اک بادہ خوار کی راتیں
گہرا گہرا وہ رنگِ چشم سیاہ
ہلکے ہلکے خمار کی راتیں
اوجِ ناز و نیاز کا عالم
عظمت و اقتدار کی راتیں
ہائے وہ حسن و عشق کی چھیڑیں
اُف وہ قول و قرار کی راتیں
روٹھنا پھر وہ خود ہی من جانا

نخوت و انکسار کی راتیں

باہمی وہ نباہ کے دعوے
وعدہ و اعتبار کی راتیں

دائمی کیف و حُسن کے لمحے
جاودانی بہار کی راتیں

گزرہی جاتی تھیں آنکھوں میں
جیسے شب زندہ دار کی راتیں

اب وہ ہنگامۂ نشاط کہاں
مٹ گئیں وہ خمار کی راتیں

ہوگئیں اختیار سے باہر
قبضہ و اختیار کی راتیں

یادِ ایّام زلیست لے کے شکیل
آگئیں پھر بہار کی راتیں

عبرت آموزِ محبت یوں ہوا جاتا ہے دل
دیکھتی جاتی ہے دُنیا، ڈوبتا جاتا ہے دل

شاہدِ نظارۂ عالم ہوا جاتا ہے دل
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے دیکھتا جاتا ہے دل

حضرتِ ناصح بجا ترغیبِ خودداری مگر
اس طریقے سے کہیں قابو میں آجاتا ہے دل

حشر تک وہ اپنی دنیا کو لئے بیٹھے رہے
لیجئے اب اُن کی دنیا سے ہٹا جاتا ہے دل

اور کیا ہوتی بنائے عالمِ دیوانگی
جب فزوں ہوتا ہے غم آنکھیں چرا جاتا ہے دل

آہ کرتا ہوں تو ہے اندیشۂ تشہیرِ غم
ضبط کرتا ہوں تو بے قابو ہوا جاتا ہے دل

ہے ازل سے مرکزِ بربادئی کامل شکیل
ہائے جس شے کو محبت میں کہا جاتا ہے دل

آگئی ہیں رحمتیں پھر جوش میں
ہوش میں اے پینے والو ہوش میں

کیا اثر تھا جذبۂ خاموش میں

خود وہ کھنچ کر آ گئے آغوش میں

سارا عالم پائے بادہ نوش پر
ایک ساغر دستِ بادہ نوش میں

اب تک اک دلکش صدائے بازگشت
گونجتی ہے پردہ ہائے گوش میں

پھر بہار آئی نئے انداز سے
اے جنونِ فتنہ ساماں ہوش میں

رہ گئی اک مسکراہٹ سی تشکیل
جذب ہو کر اُس لبِ خاموش میں

منزل کی دُھن میں ہوش و خبر سے گذر گئے
سو بار تیری راہ گذر سے گذر گئے

جو امتیازِ شام و سحر سے گذر گئے
ایسے بھی کچھ زمانے نظر سے گذر گئے

اپنی تو اب تمام ہوئی کائناتِ غم
دو اشک تھے سو دیدۂ تر سے گذر گئے

رُخ پر کسی کے ہائے وہ رنگِ سکوتِ غم
نامے حدودِ جذب و اثر سے گذر گئے
باوصفِ شوق ان کو نظر تو نہ پا سکی!
لیکن وہ ہر مقامِ نظر سے گذر گئے
ہر چند فرشِ راہ تھی ان کے لئے نگاہ
پھر بھی خبر نہیں وہ کدھر سے گذر گئے
مدت کے بعد سامنے آئے تھے وہ مگر
رسوائی جمال کے ڈر سے گذر گئے
کیا پوچھتے ہو لطفِ ہجومِ نظر شکیلؔ
کچھ تیر تھے جو قلب و جگر سے گذر گئے

رازِ الفت عیاں ہے کیا کہیئے
ہر نظر خود زباں ہے کیا کہیئے
موت کیا زندگی کی اک کروٹ
زندگی جاوداں ہے کیا کہیئے
ایک دل اور ہزار تنقیدیں

اپنی اپنی زباں ہے کیا کہیئے
چل پڑے جس طرف قدم اُٹھے
اپنی منزل کہاں ہے کیا کہیئے
عشق ناکامیاب ہو نہ سکا
سعیٔ غم رائگاں ہے کیا کہیئے
اک نظر کا تری جواب نہیں
دل بہت ناتواں ہے کیا کہیئے

شکوۂ اضطراب کون کرے
اپنی دُنیا خراب کون کرے
گن تو لیتے ہیں انگلیوں پہ گُناہ
رحمتوں کا حساب کون کرے
عشق کی تلخ کامیوں کے نثار
زندگی کامیاب کون کرے
دعوتِ میکشی اُن آنکھوں سے
جرأتِ اضطراب کون کرے

دل کا آئینہ سامنے لا کر
تجھ کو تیرا جواب کون کرے
ہم سے سرکش جو توبہ کر بیٹھیں
پھر یہ کارِ ثواب کون کرے
غرقِ جام و شراب ہو کے شکیلؔ
شغلِ جام و شراب کون کرے

مجھ سے خفا خفا بھی ہیں اور غمِ برہمی بھی ہے
موت کے ساتھ ساتھ ہی دعوتِ زندگی بھی ہے
مستِ شرابِ حسن ہوں اوج پہ تشنگی بھی ہے
وہ مرے سامنے بھی ہیں آنکھ انہیں ڈھونڈتی بھی ہے
مست ہے خوف و عار کیا صدمۂ روزگار کیا
موت کا انتظار کیا موت ہی زندگی بھی ہے
شکوۂ جورِ حسن کیوں صدمۂ دردِ ہجر کیا
دل ہے تو دل لگی بھی ہے، غم ہے تو زندگی بھی ہے
کیفِ شبِ بہار بھی، جلوۂ حسنِ یار بھی

چاند کو چاند کیا کہیں چاند میں روشنی بھی ہے
لوگ یہ کہہ اُٹھے تمام سُن کے شکیلؔ کا کلام
نغمہ نوازیاں بھی ہیں شعر میں پختگی بھی ہے

پھر اٹھی دل میں اِک موجِ شباب آہستہ آہستہ
پھر آیا زندگی میں انقلاب آہستہ آہستہ
سما کر مجھ میں وہ جانِ شباب آہستہ آہستہ
بنا دے گا مجھے اپنا جواب آہستہ آہستہ
یہ محفل زاہدانِ خشک کی محفل ہے اے رندو
ذرا اس بزم میں ذکرِ شراب آہستہ آہستہ
مری نظریں مجھی کو رفتہ رفتہ بھولے جاتی ہیں
ہوئے جاتے ہیں جلوے کامیاب آہستہ آہستہ
نہ کہیئے ہاں نہ کہیئے آپ کو مجھ سے محبّت ہے
نگاہیں خود ہی دے دیں گی جواب آہستہ آہستہ
شکیلؔ اس درجہ مایوسی شروعِ عشق میں کیسی
ابھی تو اور ہونا ہے خراب آہستہ آہستہ

الٰہی کیا یہی ہے حاصل تقدیرِ انسانی
جدھر دیکھو پریشانی - پریشانی - پریشانی
جوانی کیا محبّت کی یکایک شعلہ افشانی
محبّت کیا بس اِک کافر نظر کی سحر سامانی
بس اِک اُن کے نہ ہونے سے یہ بربادی یہ ویرانی
کِسی نے لُوٹ لی جیسے بہارِ بزمِ امکانی
تصوّر ہے کہ اک شہرِ طلسمات بیابانی!
نہ ہنگامہ نہ خاموشی نہ آبادی نہ ویرانی
مجھے سمجھا نہ اے ناصح تجھے سمجھا چکا ہوں مَیں
اگر اس پر بھی ظالم تو نہ سمجھے تیری نادانی
جو سچ پوچھو حقیقت میں وہی دل ہے کہ ہو جس میں
قیامت خیز جذباتِ محبّت کی فراوانی

رنگِ صنم کدہ جو ذرا یاد آگیا
ٹوٹیں وہ بجلیاں کہ خدا یاد آگیا
ہر چند دل کو ترکِ محبت کا تھا خیال

لیکن کسی کا عہدِ وفا یاد آگیا

جیسے کسی نے چھین لی رنگینیٔ بہار
کیا جانیے بہاریں کیا یاد آگیا

رحمت نظر بچا کے نکلنے کو تھی مگر
وہ ارتعاشِ دستِ دُعا یاد آگیا

اللہ رے ستم کہ انہیں مجھ کو دیکھ کر
سب کچھ محبتوں کے سوا یاد آ گیا

قید قفس میں مژدۂ فصلِ بہار کیا
اُڑتی ہوئی خبر ہے کریں اعتبار کیا

مایوس زندگی الم روزگار کیا
جینا تو خود ہی موت ہے جینے سے عار کیا

پنہاں ہے قہقہوں میں صدائے شکستِ دل
دُنیا اسی کا نام ہے پروردگار کیا ؟

آئینہ جمال ہے دُنیائے رنگ و بُو
آغوش کائنات ہے آغوشِ یار کیا

وعدے اور اعتبار میں ہے ربط باہمی
اس ربطِ باہمی کا مگر اعتبار کیا
زخمِ نگاہِ ناز سلامت رہے شکیلؔ
سو بار مسکرائیں گے ہم ایک بار کیا

ہم ان کی انجمن کا سماں بن کے رہ گئے
سر تا قدم نگاہ و زباں بن کے رہ گئے
پلٹے مقدرات کچھ اس طور سے کہ ہم
تصویرِ انقلابِ جہاں بن کے رہ گئے
کیا دل نہ بن سکے گا تری اِک نگاہ سے
جب دم زدن میں کون و مکاں بن کے رہ گئے
مظلوم دل کی تلخ نوائی تو دیکھنا
نغمے جو لب تک آئے فغاں بن کے رہ گئے
کرتے ہم اُن سے رازِ محبت پہ گفتگو
لیکن وہ خود ہی رازِ نہاں بن کے رہ گئے
اب ہم ہیں اور حقیقتِ آلام اے شکیلؔ
لمحے خوشی کے خوابِ گراں بن کے رہ گئے

جز نغمۂ رباب وفا اور کچھ نہیں
ظالم شکستِ دل کی صدا اور کچھ نہیں

لذت یہی، سرور یہی، زندگی یہی
دل میں ہجوم غم کے سوا اور کچھ نہیں

پس منظرِ چمن کو ذرا غور سے تو دیکھ
جز رنگ و بُو، بہار میں کیا اور کچھ نہیں

آئینہ جمالِ حقیقت ہے کائنات
سب کچھ وہی ہیں اُن کے سوا اور کچھ نہیں

پاکیزگیٔ حسنِ خیالات کی قسم
سب کچھ ہے عاشقی میں روا اور کچھ نہیں

یُوں دیکھتا ہوں جلوۂ نقش و نگارِ دہر
جیسے نظر میں اُن کے سوا اور کچھ نہیں

اب ہم ہیں اور میکدۂ حسن اے شکیل
شغل اپنا میکشی کے سوا اور کچھ نہیں

قصر ویران ہوا جاتا ہے

دل پریشان ہوا جاتا ہے
حرم و دیر کے جلووں کی قسم
کفر ایمان ہوا جاتا ہے
تابِ نظارہ الٰہی توبہ
جلوہ حیران ہوا جاتا ہے
نالہ آغوشِ اثر تک آ کر
خود پشیمان ہوا جاتا ہے
بے پئے شیخ فرشتہ تھا مگر
پی کے انسان ہوا جاتا ہے
دل ہے آمادۂ تکمیل نشاط
غم کا سامان ہوا جاتا ہے
کچھ نہیں ہستی پروانہ مگر
بزم کی جان ہوا جاتا ہے
اللہ اللہ کہ انہیں کا پر تو
اُن پہ قربان ہوا جاتا ہے
ہر ورق شرحِ محبت کا شکیل
اپنا دیوان ہوا جاتا ہے

کام آ ہی جائے گی سعیٔ رائگاں اِک دن
خود جبیں کو ترسے گا سنگِ آستاں اِکدن

وہ نہیں تو اُن کا غم دل میں جاگزیں ہوگا
زندگی میں ہونا ہے یوں بھی شادماں اِکدن

دِل تجھے مبارک ہو تیرا زعم خودداری
اور اگر وہ آ جائیں شکوہ برزباں اِک دن

حُسن و عشق کی منزل اور ہم ارے توبہ
کچھ یُوں ہی سی دیکھی تھی گردِ کارواں اِک دن

اب کسی سے کیا پُوچھیں غم کی انتہا کیا ہے
خود جواب دے دیگا قلبِ ناتواں اِکدن

دل لذتِ نگاہِ کرم پا کے رہ گیا
کتنا حسین خواب نظر آ کے رہ گیا

لب تک شکایتِ غمِ دل لا کے رہ گیا
ان کی ندامتوں پہ میں شرما کے رہ گیا

میرے دلِ تباہ کا عالم نہ پُوچھئے!

اِک پھُول تھا جو کھلتے ہی مُرجھا کے رہ گیا

منزل سے دُور رہروِ منزل تھا مطمئن
منزل قریب آئی تو گھبرا کے رہ گیا

شوریدگیِ نالۂ گستاخ کیا کہوں!
اس قلبِ نازنیں کو بھی تڑپا کے رہ گیا

بیگانہ وار جب وہ گذرتے چلے گئے
کچھ بے قرار دل مجھے سمجھا کے رہ گیا

ان کے حضور لب تو مگر نہ کھل سکے
روداد غم نگاہ سے دُہرا کے رہ گیا

یُوں ختم داستانِ محبت ہوئی شکیلؔ
جیسے کوئی حسین غزل گا کے رہ گیا

کشمکشِ حیات کو جزوِ حیات پا کے ہم
ہر غمِ بے پناہ پر رہ گئے مُسکرا کے ہم

جذب انہیں میں ہو گئے اُن کے حضور جا کے ہم
اپنی نظر سے کھو گئے اُن سے نظر ملا کے ہم

رہ گئے تشنہ کام ہی تشنہ لبی مٹا کے ہم
دیکھ تو ہم کو ساقیا رند ہیں کس بلا کے ہم

غم ہی سکوں نواز تھا غم ہی خوشی کا راز تھا
آہ کہ خوش نہ رہ سکے غم سے نجات پا کے ہم

اس نے مزاج یار کو زحمت برہمی نہ دی
شکر گزار کیوں نہ ہوں نالۂ نارسا کے ہم

تازہ بہ تازہ توبہ نو اُف وہ فریب کاریاں
بیٹھ سکے نہ مطمئن حسن کو آزما کے ہم

زندگی اُن کی چاہ میں گذری
مستقل درد و آہ میں گذری

رحمتوں سے نباہ میں گذری
عمر ساری گناہ میں گذری

ہائے وہ زندگی کی اک ساعت
جو تری بارگاہ میں گذری

سب کی نظروں میں سربلند رہے

جب تک اُن کی نگاہ میں گذری
میں وہ اِک رہروِ محبت ہوں
جس کی منزل بھی راہ میں گذری
اِک خوشی ہم نے دل سے چاہی تھی
وہ بھی غم کی پناہ میں گذری
زندگی اپنی اے شکیلؔ اب تک
تلخیٔ رسم و راہ سے گذری!

عالم نہ پوچھئے جو ہمارا ہے آج کل
کشتی بھنور میں دُور کنارا ہے آج کل
تیرے ہی غم کا دل کو سہارا ہے آج کل
بے کیف زندگی بھی گوارا ہے آج کل
اللہ رے انقلاب کہ اِک بادہ خوار کا
دو چار آنسوؤں پر گذرا ہے آج کل
وہ دَورِ ماہتاب یہ رنگِ شبِ بہار
فطرت نے گیسوؤں کو سنوارا ہے آج کل

اِک بار کہہ کے پھر یہ زباں سے نہ کہہ سکے
ہم جس کے ہو گئے وہ ہمارا ہے آج کل
باقی رہا تھا زندہ دلوں میں بس اک شکیلؔ
وہ بھی غمِ فراق کا مارا ہے آج کل

طوفِ حرم نہ دیر کی گہرائیوں میں ہے
جو لُطف اُن کے در کی جبیں سائیوں میں ہے
حیرت نگاہِ شوق کی پسپائیوں میں ہے
جلوہ بذاتِ خود ہی تماشائیوں میں ہے
ظاہر یہ کر رہی ہیں شبِ غم کی نُزہتیں
کوئی چھُپا ہوا مری تنہائیوں میں ہے
دُنیائے رنگ و بُو سے گذر کر یہ چلا
پوشیدہ کوئی رُوح کی گہرائیوں میں ہے
پاتا ہوں ان کو ہر نفس اضطراب میں
موجِ سکوں بھی دَور کی انگڑائیوں میں ہے
میرا جنونِ شوق ہی کیوں ہو قصور وار

شامل تری نگاہ بھی رسوائیوں میں ہے
اے شمع پر غرور ذرا غور سے تو دیکھ!
یہ کس کی روشنی تری پرچھائیوں میں ہے
اس کے لئے تشکیل خزاں کیا بہار کیا
ڈوبا ہوا جو حسن کی رعنائیوں میں ہے

منظر کوئی فردوس نظر ڈھونڈھ رہا ہوں
تاروں کے تبسم میں سحر ڈھونڈھ رہا ہوں
ہر گوشۂ جز آغوشِ نظر ڈھونڈھ رہا ہوں
توبہ وہ کہاں ہیں میں کدھر ڈھونڈھ رہا ہوں
ہر گام پہ ہے خواہش تکمیل محبت
منزل کو سرِ راہ گذر ڈھونڈھ رہا ہوں
ہر لحظہ انہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں نگاہیں
میں خود کو بہ اندازِ دگر ڈھونڈھ رہا ہوں
گو رفعتِ کونین نگاہوں سے ہے پامال
لیکن حدِ پروازِ نظر ڈھونڈھ رہا ہوں

بیتابیٔ دل سے مجھے اُمید سکوں ہے
ناکام دعاؤں میں اثر ڈھونڈھ رہا ہوں
اب تک وہی عالم ہے شکیلؔ اپنے جنوں کا
صحرا میں ہوں لیکن گُل تر ڈھونڈھ رہا ہوں

ہو ہے رائیگاں تری جستجو، یہ مری نظر کی خطا نہیں
میں وہ گردِ راہ مجاز ہوں جسے خود ہی اپنا پتہ نہیں
یہ نہیں کہ بابِ حریم سے جو طلب کیا وہ ملا نہیں
مگر اتنی بات ضرور ہے کہ اثر بقدرِ دُعا نہیں
میں قریبِ مرگ سے دُور ہوں کہ ترا ہی پرتوِ نور ہوں
مری عمر، عمرِ دوام ہے مجھے اعتقادِ فنا نہیں
قسم ارتکابِ گناہ کی، قسم التفاتِ نگاہ کی
وہ نہ مرتبہ کوئی پا سکا جو تری نظر سے گرا نہیں
وہی ایک سجدہ ہے کارگر جو ہو فکر و ہوش سے ماورا
وہ ہزار سجدے فضول ہیں جو رہینِ لغزشِ پا نہیں
میں شکیلؔ دل کا ہوں ترجماں کہ محبتوں کا ہوں راز داں
مجھے فخر ہے مری شاعری مری زندگی سے جُدا نہیں

لطیف پردوں سے تھے نمایاں مکیں کے جلوے مکاں سے پہلے
محبت آئینہ ہو چکی تھی، وجود بزم جہاں سے پہلے

نہ وہ مرے دل سے باخبر تھے نہ اُن کو احساسِ آرزو تھا
مگر نظامِ وفا تھا قائم کشودِ رازِ نہاں سے پہلے

ہر ایک عنوانِ دردِ فرقت ہے ابتدا شرحِ مدعا کی
کوئی بتائے کہ یہ فسانہ سنائیں ان کو کہاں سے پہلے

مسرتیں رازدارِ غم تھیں مسرتوں میں الم تھا پنہاں
جبھی تو صحنِ چمن میں شاید بہار آئی خزاں سے پہلے

سمجھ رہا تھا کہ ناامیدی نہ پردہ دارِ امید ہو گی!
نظر اُٹھا کر جو میں نے دیکھا غبار تھا کارواں سے پہلے

اٹھا جو مینا بدست ساقی رہی نہ کچھ تابِ ضبط باقی!
تمام میکش پکار اُٹھے "یہاں سے پہلے یہاں سے پہلے"

قسم فریبِ نگاہ و دل کی ہمیں تو اس جستجو نے کھویا
وہیں تھی دراصل اپنی منزل قدم اُٹھے تھے جہاں سے پہلے

ازل سے شاید لکھے ہوئے تھے شکیل قسمت میں جورِ پیہم
کھلی جو آنکھیں اس انجمن میں نظر ملی آسماں سے پہلے

غمِ عاشقی کے نظام اور بھی ہیں
نظر کے سوا برق دوام اور بھی ہیں

جہاں نو بہ نو صبح و شام اور بھی ہیں
محبت میں ایسے مقام اور بھی ہیں

ذرا صبر کر اے حیاتِ دو روزہ
ابھی مجھ کو دُنیا میں کام اور بھی ہیں

فریبِ وفا پر ہی کیا منحصر ہے
مری ذات پر اتہام اور بھی ہیں

مجھی کو نہ ڈھونڈھ انقلابِ زمانہ
طلب گارِ عیشِ دوام اور بھی ہیں

سکوتِ لبِ نامہ بر سے ہے ظاہر
ابھی زیرِ لب کچھ پیام اور بھی ہیں

محبت کا لفظ ان کے مُنہ سے نہ نکلا
یقیناً محبت کے نام اور بھی ہیں

شکیلؔ اپنے دل کی تباہی کا کیا غم
فسانے ابھی ناتمام اور بھی ہیں

رہ تصوّر میں کھونے والے شبِ الم سازگار سمجھے
نظر کی موہوم تابشوں کو تجلّیِ حُسنِ یار سمجھے
یہاں تو اک عمر حسرتوں میں گذار دی ہے گذار دینگے
یہ عہد فردا اُسے مبارک جو معنیٔ اعتبار سمجھے
سمجھ سمجھ اے دلِ شکستہ جنونِ تکمیلِ شوق بےجا!
اُمیدِ لُطف اس نگاہ سے کیا جو ایک جنبش کو بار سمجھے

نگاہِ ناز کا اک وار کر کے چھوڑ دیا
دلِ حریف کو بیدار کر کے چھوڑ دیا!
ہوئی تو یُوں ہوئی تردیدِ عہدِ لطف و کرم
دبی زبان سے اقرار کر کے چھوڑ دیا
چھپے کچھ ایسے کہ تا زیست پھر نہ آئے نظر
رہینِ حسرتِ دیدار کر کے چھوڑ دیا
مجھے تو قیدِ محبت عزیز تھی لیکن
کسی نے مجھ کو گرفتار کر کے چھوڑ دیا
نظر کو جرأتِ تکمیلِ بندگی نہ ہوئی

طوافِ کوچہ دلدار کر کے چھوڑ دیا

خوشا وہ کشمکشِ ربطِ باہمی جس نے

دل و دماغ کو بیکار کر کے چھوڑ دیا

زہے نصیب کہ دُنیا میں تیرے غم نے مجھے

مُسرتوں کا طلب گار کر کے چھوڑ دیا

کرم کی آس ہیں اب کس کے در پہ جائے شکیلؔ

جب آپ ہی نے گنہگار کر کے چھوڑ دیا

شاید آغاز ہوا پھر کسی افسانے کا

حکم آدم کو ہے جنّت سے نکل جانے کا

اُن سے کچھ کہہ تو رہا ہوں مگر اللہ کرے

وہ بھی مفہوم نہ سمجھیں مرے افسانے کا

دیکھنا دیکھنا یہ حضرت واعظ ہی نہ ہوں

راستہ پوچھ رہا ہے کوئی میخانے کا

بے تعلّق ترے آگے سے گذر جاتا ہے

یہ بھی اِک حسنِ طلب ہے ترے دیوانے کا

حشر تک گرمیٔ ہنگامۂ ہستی ہے شکیلؔ
سلسلہ ختم نہ ہوگا مرے افسانے کا

جفاؤں پر ملال آتا تو ہوگا
اُنہیں میرا خیال آتا تو ہوگا
جھلکتے ہوں گے جب آنکھوں میں آنسو
وہ دورِ انفعال آتا تو ہوگا
سرِ بزمِ تصور شکوہ بر لب
کوئی آشفتہ حال آتا تو ہوگا
شبِ فرقت کی تنہائی میں اکثر
مسرت پر زوال آتا تو ہوگا
معمہ بن کے اکثر اُن کے دل میں
محبت کا سوال آتا تو ہوگا
وہ پا لیتے تو ہوں گے دل پر قابو
انہیں یہ بھی کمال آتا تو ہوگا

لمحہ لمحہ بار ہے تیرے بغیر
زندگی دشوار ہے تیرے بغیر

دِل کی بیتابی کا عالم کیا کہوں
ہر نفس تلوار ہے تیرے بغیر

مجمع احباب و اربابِ وفا
مجمع اغیار ہے تیرے بغیر

تجھ سے برہم ہوں کبھی خود سے خفا
کچھ عجب رفتار ہے تیرے بغیر

زندگی ہے موت ایک ایک گام پر
برسرِ پیکار ہے تیرے بغیر

عالم فرقت میں ذکر خواب کیا
نیند خود بیدار ہے تیرے بغیر

شامِ غم کروٹ بدلتا ہی نہیں
وقت بھی خوددار ہے تیرے بغیر

آمسیحا آکہ اب تیرا شکیلؔ
جان سے بیزار ہے تیرے بغیر

ہر نفس عزمِ خطا کوشی بروئے کار تھا
سچ تو یہ ہے آدمی بننا بہت دشوار تھا

دل کو کیا کہیئے حریفِ برقِ حُسنِ یار تھا
جس کو ہم مجبُور سمجھے تھے وہی مختار تھا

لاؤ مرتے دم خدا کا نام لے کر پی ہی لوں
ورنہ لوگ الزام رکھ دینگے کہ دُنیا دار تھا

زندگی میں جبر کی اِک وہ بھی منزل تھی جہاں
حُسن پابند محبت عشق خود مختار تھا

ناز سے آئے تصوّر میں وہ جب یادش بخیر
حسرتِ دل سو رہی تھی دردِ دل بیدار تھا

ہائے وہ عالم جنونِ بیخودی کا اے شکیلؔ
قلبِ نازک پر جب احساسِ محبت بار تھا

وہ دل میں رہتے ہیں دل کا نشاں نہیں معلوم
مکیں کو ڈھونڈھ رہا ہوں مکاں نہیں معلوم

سکوں سا پانے لگا ہوں غم محبت میں

کہاں گئیں مری بیتابیاں نہیں معلوم

مسرتوں کا تو سطحی مطالعہ ہے مگر
غمِ حیات کی گہرائیاں نہیں معلوم

فغاں نصیب کی وارفتگی ارے توبہ
فغاں نصیب کو وجہ فغاں نہیں معلوم

چمن کی فکر بھی کر آشیاں کی فکر کے ساتھ
کدھر کو ٹوٹ پڑیں بجلیاں نہیں معلوم

وفا شعار تہی دست آئے منزل پر
کہاں کہاں پہ لٹا کارواں نہیں معلوم!

شکیلؔ آئینہ ہے دورِ انقلاب مگر
مآلِ قسمتِ ہندوستاں نہیں معلوم

ذکرِ جفا کئے بغیر اب نہ قرار آئیگا
جا کے منا ہی لیں گے ہم جب کوئی روٹھ جائیگا

موج میں آ کے دل کبھی نغمۂ غم جو گائیگا
عالمِ رنگ و بُو تمام درد میں ڈوب جائیگا

قہر بھری نگاہ سے عکس حسیں نہ دیکھئے
جذبِ نگاہ کی قسم آئینہ ٹوٹ جائیگا
رہرو عشق ہوں تشکیل راہنما سے مجھ کو کیا
راہنما بھی میرے ساتھ راستہ بھول جائیگا

میرے ہی غم کی ترجماں فطرت بے زباں نہ ہو
مجھ کو وہ داستاں سنا جو مری داستاں نہ ہو
عقل جنوں نواز سُن تجھ پر اگر گراں نہ ہو
حُسن خود اپنی ذات ہے عشق جو درمیاں نہ ہو
سدِرہ نگاہ ہے دُور کچھ اک غبار سا
جس کی مجھے تلاش ہے یہ وہی کارواں نہ ہو
نظر اٹھا کے دیکھ خود میں کبھی سما کے دیکھ
دیدہ و دل کی آڑ میں جلوہ بے اماں نہ ہو
حُسن کی اصطلاح میں جبر کا نام عشق ہے
غم ہو مگر گلہ نہ ہو دل ہو مگر زباں نہ ہو
آتشِ ضبط سے مفر یوں تو فغاں میں ہے مگر

ہائے وہ ناتواں جسے حوصلہ فغاں نہ ہو

میری نظر میں واقعی ہے وہ بلا کا خود غرض
تو جسے غم عطا کرے اور وہ شادماں نہ ہو

شعر و ادب کو آج بھی صنفِ غزل پہ ناز ہے
سعیٔ مخالفت شکیلؔ ڈر ہے کہ رائگاں نہ ہو

تری نظر کو مرے دل سے واسطہ نہ رہا
غلط کہ موج کو ساحل سے واسطہ نہ رہا

ہے عین راہ پہ گم کردہ راہیوں کی قسم
وہ کارواں جسے منزل سے واسطہ نہ رہا

خطا معاف یہ رنگینیاں کہاں ہوں گی؟
اگر مجھے تری محفل سے واسطہ نہ رہا

جو کل تک اپنے لئے جانِ زندگی تھے شکیلؔ
اب ان حسین مشاغل سے واسطہ نہ رہا

جنوں سے گذرنے کو جی چاہتا ہے

ہنسی ضبط کرنے کو جی چاہتا ہے
جہاں عشق میں ڈوب کر رہ گئے ہیں
وہیں پھر ابھرنے کو جی چاہتا ہے
وہ ہم سے خفا ہیں ہم اُن سے خفا ہیں
مگر بات کرنے کو جی چاہتا ہے
ہے مدت سے بے رنگ نقشِ محبّت
کوئی رنگ بھرنے کو جی چاہتا ہے
بہ ایں خودسریِ و غرورِ محبّت !!!
انہیں سجدہ کرنے کو جی چاہتا ہے
قضا مژدۂ زندگی لے کے آئے
کچھ اس طرح مرنے کو جی چاہتا ہے
نظامِ دو عالم کی ہو خیر یارب
پھر اک آہ کرنے کو جی چاہتا ہے
گناہِ مکرّر شکیل اللہ اللہ
بگڑ کر سنورنے کو جی چاہتا ہے

اب تک جو چھپایا تھا تو نے اپنی ہی نظر کے پردے میں
بے پردہ ہوا وہ رازِ ازل تخلیق بشر کے پردے میں
فطرت کے حسین نظاروں کی اس خاص کشش کو کیا کہیئے
پوشیدہ ہیں وہ نظروں سے مگر رہتے ہیں نظر کے پردے میں
اے رہروِ راہِ عشق وفا رفتار نگاہ و دل پہ نہ جا
ہر گام پہ اک منزل ہے نئی اس راہ گذر کے پردے میں

وہ ہم سے دور ہوتے جا رہے ہیں
بہت مغرور ہوتے جا رہے ہیں
بس اب ترکِ محبّت کے ارادے
ہمیں منظور ہوتے جا رہے ہیں
مناظر تھے جو فردوسِ تصوّر
وہ سب مستور ہوتے جا رہے ہیں
بدلتی جا رہی ہے دل کی دُنیا
نئے دستور ہوتے جا رہے ہیں!
بہت مغموم تھے جو دیدہ و دِل

بہت مسرور ہوتے جا رہے ہیں
وفا پر مُردنی سی چھا چلی ہے
ستم کافور ہوتے جا رہے ہیں
کبھی وہ پاس آتے جا رہے تھے
مگر اب دُور ہوتے جا رہے ہیں
فراق و ہجر کے تاریک لمحے
سراپا نور ہوتے جا رہے ہیں
شکیلؔ احساس گمنامی سے کہہ دو
کہ ہم مشہور ہوتے جا رہے ہیں

رنگ بدل کے رہ گیا گلشنِ روزگار بھی
ہم سے خفا وہ کیا ہوئے رُوٹھ گئی بہار بھی
نخوتِ بے اماں کے ساتھ شوخیِ انکسار بھی
کتنا ستم ظریف ہے حُسنِ ستم شعار بھی
آ ہی گئے وہ روبرو وعدہ نو کئے ہوئے
جُرمِ لطیف بن گئی لغزشِ اعتبار بھی

رعنائی بہارِ گل و گلستاں گئی
وہ کیا گئے کہ رونقِ بزمِ جہاں گئی
ملتے ہی اُن سے کشمکشِ جسم و جاں گئی
ہوش آ گیا تو وحشتِ خوابِ گراں گئی
آخر غبارِ راہِ محبت بھی چھُپ گیا
کچھ دُور تو نگاہ پسِ کارواں گئی
وہ آج مطمئن نظر آتے ہیں بزم میں
شاید کسی کی سعیِ فغاں رائگاں گئی
غم ہو کہ انبساط کسی کو نہیں قرار
فصلِ بہار آئی تو فصلِ خزاں گئی
اب اس فریب خوردہ تمنّا کو کیا کروں
جو تیری انجمن سے بہت شادماں گئی
کہیئے جنابِ شیخ یہ مے ہے یہ میکدہ
اب آرزوئے کوثر و جنت کہاں گئی
اے کامیاب سعیٔ مدارا خطا معاف
پھر کیا رہا جو لذّتِ دردِ نہاں گئی

اتنی مشابہت رہی تجھ میں ترے خیال میں
دیدہ و دل نہ پا سکے فرصت انتظار میں

لذّتِ یاس و لطفِ غم قلبِ حزیں سے پوچھ لے
غم کدہ حیات ہے جنّت روزگار بھی

ہیں روشیں جدا جدا ہوں میں بیک زماں نہ تشکیل
حامل ذوق شعر بھی، مائل روزگار بھی

وہ ایک تیر اخراش آگیں جو دل سے نکلے گا آہ بن کر
انہیں کے سینے میں چبھ نہ جائے کہیں انہیں کی نگاہ بن کر

کوئی بتائے کہ رہنما نے کیا بھی کیا خیر خواہ بن کر
ہم اپنی منزل پہ رفتہ رفتہ پہونچ گئے گرد راہ بن کر

ہماری شرحِ وسازِ فرقت تو ختم ہوتی نہ تا قیامت
مگر ہوئی مختصر کچھ اتنی کہ رہ گئی صرف آہ بن کر

قسم نظر سوز طلعتوں کی جو میں حجاب نیاز اٹھا دوں
تمام عالم کو جگمگا دوں تجلّی بے پناہ بن کر

گناہ میں بھی کشمش بلا کی دعا کو ہاتھ اس لئے نہ اٹھے
مجھے یہ ڈر تھا کہ تیری رحمت بھی رہ نہ جائے گناہ بن کر

تری یاد سے دلِ فروزاں کرینگے
پھر اس غم کدے میں چراغاں کرینگے

ذرا حضرتِ دل کی جرأت تو دیکھو
یہ نظارۂ حُسنِ جاناں کریں گے

زمانہ جو آتش فشاں ہے تو کیا غم
ہم آتش کدے کو گلستاں کریں گے

چلے تو ذرا دورِ جامِ محبّت
فرشتے بھی تقلیدِ انساں کریں گے

سلامت روی جرم سمجھے گی دُنیا
کسی سے اگر ذکرِ طوفاں کریں گے!

جو آسانیوں کو بھی مشکل بنا دیں
وہ کیا میری مشکل کو آساں کرینگے

شکستِ شیشۂ عقل و شعور دیکھیں گے
قریب دیکھیں گے اُن کو تو دُور دیکھیں گے

کبھی تو اوجِ دلِ ناصبور دیکھیں گے

اس آئینے میں وہ صورت ضرور دیکھیں گے
نفس نفس ہے اگر آشنائے ذوقِ طلب
نظر نظر کو انہیں کے حضور دیکھیں گے
معاملاتِ محبت میں دیکھنا یہ ہے
وہ کیا کرینگے جب اپنا قصور دیکھیں گے
ذرا نقاب حسیں رُخ سے تم الٹ دینا
ہم اپنے دیدہ و دل کا غرور دیکھیں گے
ہزار پردوں میں چھپ جائیں وہ تو کیا حاصل
شکیلؔ دیکھنے والے ضرور دیکھیں گے

جلوۂ معتبر کو کیا کہیئے
دل نہیں دل نظر کو کیا کہیئے
جو گذرتے ہیں آہ تیرے بغیر
ایسے شام و سحر کو کیا کہیئے
عشق نے پا لیا خود اپنا مقام
اُن کی پہلی نظر کو کیا کہیئے

رُخ سے اُلٹا تو تھا کسی نے نقاب
قصّہ مختصر کو کیا کہیئے

دُور ہو کر بھی پاس ہے کوئی!
اہتمامِ نظر کو کیا کہیئے

تھا مقدّر میں گھُٹ کے مر جانا
غفلتِ چارہ گر کو کیا کہیئے

مجھ سے غافل بھی میری جانب سے
احتیاطِ نظر کو کیا کہیئے!

زندگی مدہوش ہو کر رہ گئی
اُن سے ہم آغوش ہو کر رہ گئی

میں نے جب دیکھا تو وہ برقِ جمال
دفعتاً روپوش ہو کر رہ گئی

عشق پروانوں کو تھا وہ جل گئے
شمع کیوں خاموش ہو کر رہ گئی

دیکھیئے لِللہ دامن کی ہوا

آرزو بے ہوش ہو کر رہ گئی
کھل تو جائے گی زباں اُن کے حضور
اور اگر خاموش ہو کر رہ گئی

ہر مسرت سے گریزاں نظر آتا ہے مجھے
دل حریفِ غمِ جاناں نظر آتا ہے مجھے
تو محبت کا نگہباں نظر آتا ہے مجھے
یا کوئی خوابِ پریشاں نظر آتا ہے مجھے
جب سے چھایا ہے تری یاد کا عالم دل پر
ہر نفس شعلہ بداماں نظر آتا ہے مجھے
کچھ مجھی تک نہیں محدود مرا ذوقِ جنوں
پھول بھی چاک گریباں نظر آتا ہے مجھے
اپنی جاتی ہوئی دُنیا کی قسم اے غمِ ہجر
تو بھی اک رات کا مہماں نظر آتا ہے مجھے
سن کر ذات تری بحث مسلّم لیکن
یوں وہ کچھ اور نمایاں نظر آتا ہے مجھے

ایک واعظ ہی تھا منجملہ اربابِ خلوص
وہ بھی اس دَور کا انساں نظر آتا ہے مجھے

اُن کو شرحِ غم سنائی جائے گی
آگ پانی میں لگائی جائے گی

کچھ کے دیکھیں گے کسی سے ایک بار
یُوں بھی قسمت آزمائی جائیگی

تیری نظروں میں ہے جو تاثیرِ جذب
اب مرے نالوں میں پائی جائیگی

میری صبحِ زندگی کی اک جھلک
ڈوبتے تاروں میں پائی جائے گی

آپ ہی کہیئے کہ موجِ اضطراب
آپ سے کیونکر چھپائی جائیگی

راز رکھ رازِ محبت اے شکیلؔ
یہ غزل محفل میں گائی جائے گی

حسن پابندِ رہ و رسمِ وفا کیوں نہ رہا
ہائے پہلا سا محبّت میں مزا کیوں نہ رہا
اکثر آتا ہے غمِ عشق میں وہ بھی عالم!
سوچتا ہوں تری نظروں سے جدا کیوں نہ رہا
بے خودی دائرۂ ہوش میں آ ہی جاتی
اور دو چار گھڑی پردہ اُٹھا کیوں نہ رہا
تیری افسردہ نگاہی سے یہ شکوہ ہے کہ میں
راز بن کر ترے سینے میں چُھپا کیوں نہ رہا
حسن کے حسنِ ندامت کی قسم کیا کہئیے
دل کو اب حوصلہ ترکِ وفا کیوں نہ رہا
دیں صدائیں درِ انساں ہی پہ انسان شکیلؔ
ہائے دُنیا میں غریبوں کا خدا کیوں نہ رہا

محبّت نے ہمیں پہونچا دیا یہ کن منازل میں
نہ حرفِ مدعا لب پر نہ کوئی آرزو دل میں
نظر بیگانۂ وسعت نہ ذوقِ جستجو دل میں

اُلجھ کر کیوں نہ رہ جاؤں حجاباتِ مقابل میں
ہلاک خیز ہیں ناز و نیازِ شمع و پروانہ
کہ ان جھگڑوں سے اکثر آگ لگ جاتی ہے محفل میں
ہزاروں نے رہِ عشق و وفا میں ٹھوکریں کھائیں
نہ پہونچا آج تک دیوانہ کوئی حدِّ منزل میں
یہاں بھی تو وہاں بھی تو ہمیں خلوت سے کیا مطلب
تری محفل سے اُٹھ کر بھی رہیں گے تیری محفل میں
بہ اندازہ ہوا لمحاتِ فرصت میں شکیلؔ اکثر
بہر عنواں اضافہ ہوتا جاتا ہے مشاغل میں

تمہیدِ ستم اور ہے تکمیلِ جفا اور
چکھنے کا مزہ اور ہے پینے کا مزہ اور
تاثیر تو تاثیر تصوّر ہے گریزاں
راتوں کو ذرا مانگیئے اُٹھ اُٹھ کے دعا اور
دونوں ہی بنائے کشش و جذب ہیں لیکن
نغموں کی صدا اور ہے نالوں کی صدا اور

اے فطرتِ غمِ زلیست ہی کیا کم تھی مُصیبت
نازل ہوئی اُس پر یہ محبت کی بلا اور
ٹکرا کے وہیں ٹوٹ گئے شیشہ و ساغر
میخواروں کے جھرمٹ میں جو ساقی نے کہا "اور"
وہ خود نظر آتے ہیں جفاؤں پر پشیماں
کیا چاہیئے اب تم کو شکیل اس کے سوا اور

یہ کیا طلسم غم کدۂ کائنات ہے
باوصفِ مہر و ماہ نہ دن ہے نہ رات ہے
دل بے نیازِ آرزوئے التفات ہے
شاید اسی کا نام سکونِ حیات ہے
آزاد لاکھ اسیرِ غمِ عشق ہو تو کیا
یہ قید کم نہیں کہ بقیدِ حیات ہے
اپنا ہی عکس دیکھتا رہتا ہوں چار سو
عالم تمام آئینۂ حسنِ ذات ہے
انساں ہزار منزلِ رفعت پہ ہو شکیل
ایسے میں خود کو بھول نہ جائے تو بات ہے

اندازِ مداوائے جنوں کام نہ آیا
کوشش تو بہت کی مگر آرام نہ آیا

ساقی کو خیالِ کرمِ عام نہ آیا
ہاتھوں میں نہ آنا تھا مرے جام نہ آیا

ہم صید جہاں صید نظر صید زباں صید
سب صید مگر تو ہی تہِ دام نہ آیا

جب تک وہ تجلی رہی آغوشِ نظر میں
بھولے سے بھی ذکر سحر و شام نہ آیا

یوں کم نہ ہوئی رونقِ ہنگامۂ محفل
محفل میں کوئی واقفِ انجام نہ آیا

صد حیف کہ برباد ہوئے ہم تری خاطر
صد شکر کہ تجھ پر کوئی الزام نہ آیا

اعجازِ مسیحا پہ شکیل آپ ہیں نازاں
اعجازِ مسیحا بھی اگر کام نہ آیا

تغافل بھی، بے مہریاں بھی، جفا بھی
یہ سب کچھ سر آنکھوں پہ لیکن خطا بھی
بہت کچھ کیا ضبط شکووں پہ لیکن
اُن آنکھوں سے بارِ ندامت اُٹھا بھی
میں اس جذبِ محکم کے قربان جاؤں
تجھی سے محبت ہے تیرے سوا بھی
بقیدِ جنوں و خرد ہے وہ جلوہ
حضورِ نظر بھی، نظر سے جدا بھی
نظر باز کر لیں خودی کو مکمل
خودی کے حجابات میں ہے خدا بھی

تکمیل شباب چاہتا ہوں
ہو جاؤں خراب چاہتا ہوں
سر معرکہ الم ہے کرنا
تھوڑی سی شراب چاہتا ہوں
اپنی ہی لطافتِ نظر کی

اُس رُخ پہ نقاب چاہتا ہوں

ہو خیر محبتوں کی یا رب!
ظالم سے جواب چاہتا ہوں

ہاں اے غمِ عشرتِ گذشتہ
اِک فرصتِ خواب چاہتا ہوں

اس چھیڑ پہ زندگی تصدّق
بے وجہ عتاب چاہتا ہوں

وہ مجھ سے سوال کر رہے ہیں
میں اُن سے جواب چاہتا ہوں

کچھ ایسی حقیقتیں ہیں جن کو
پابندِ حجاب چاہتا ہوں

آنکھ سے آنکھ ملاتا ہے کوئی
دل کو کھینچے لئے جاتا ہے کوئی

وائے حیرت کہ بھری محفل میں
مجھ کو تنہا نظر آتا ہے کوئی

صبح کی مست فضاؤں کی قسم
روز آ آ کے جگاتا ہے کوئی
منظرِ حسن دو عالم کے نثار
مجھ کو آئینہ دکھاتا ہے کوئی
چاہیئے خود پہ یقینِ کامل
حوصلہ کس کا بڑھاتا ہے کوئی
سب کرشماتِ تصور ہیں شکیل
ورنہ آتا ہے نہ جاتا ہے کوئی

مری زندگی پہ نہ مسکرا مجھے زندگی کا الم نہیں
جسے تیرے غم سے ہو واسطہ وہ خزاں بہار سے کم نہیں
مرا کفر حاصلِ زہد ہے مرا زہد حاصل کفر ہے
مری بندگی وہ ہے بندگی جو رہینِ دیر و حرم نہیں
مجھے راس آئیں خدا کرے یہی اشتباہ کی ساعتیں
انہیں اعتبار وفا تو ہے مجھے اعتبارِ ستم نہیں
وہی کارواں وہی راستے وہی زندگی وہی مرحلے

مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں

نہ وہ شانِ جبرِ شباب ہے نہ وہ رنگ قہر عتاب ہے
دل بے قرار پہ ان دنوں ہے ستم یہی کہ ستم نہیں

نہ فنا مری نہ بقا مری مجھے اے شکیلؔ نہ ڈھونڈیے
میں کسی کا حُسنِ خیال ہوں مرا کچھ وجُود عدم نہیں

ستم کی ہر ادا اب تک تو ہم دوشِ قیامت ہے
ستم میں سادگی بھی ہو گئی شامل تو کیا ہوگا

جہنم کی طرف لے جانے والے اہل عصیاں کو
کسی کی شانِ رحمت ہو گئی حائل تو کیا ہوگا

سکوتِ حُسن د تاثیر محبت اے معاذ اللہ
اگر طوفاں کی جانب کھنچ گیا ساحل تو کیا ہوگا

بچھڑ کر کارواں سے خضر کی منّت بجا لیکن
جو نکلے خضر بھی گم کردہ منزل تو کیا ہوگا

غرور اتنا شکیلؔ اس شوخ کی بے اعتنائی پر
کہیں تم کو سمجھ لے وہ کسی قابل تو کیا ہوگا

دیتی ہیں بہاریں ہمیں پیغام سکوں کیا
معلوم نہیں فطرتِ اربابِ جنوں کیا
اس مشقِ تغافل کی قسم یہ تو بتا دے
تا عمر میں بیتاب ہی بیتاب رہوں کیا
ہاں تیری خوشی میری خوشی ہے مگر اے دوست
اس لطفِ مسلسل کا بھی شکوہ نہ کروں کیا
مخلوق بھی ہستی مری خالق کبھی مری ذات
اس پر بھی مجھے علم نہیں ہے کہ میں ہوں کیا
سب تیری محبت کی عنایات ہیں ورنہ
میں کیا، مرا دل کیا۔ مرے اندازِ جنوں کیا
مانا کہ بہت تلخ ہے انجامِ تمنّا
یہ غم تری خاطر بھی گوارا نہ کروں کیا
اِک عالمِ عرفانِ حقیقت ہے محبّت
اِک منزلِ ادراک محبت ہے جنوں کیا

بن جائے قہر عشرتِ پیہم کبھی کبھی

دل کو سکوں نہ دے جو ترا غم کبھی کبھی
لمحاتِ یادِ دوست کو صرفِ دعا نہ کر

آتے ہیں زندگی میں یہ عالم کبھی کبھی
زاہد کی مے کشی پہ تعجب نہ کیجیے

لاتی ہے رنگ فطرتِ آدم کبھی کبھی
مرکز سے ہو کے دور بہ ایں اختصارِ عمر

روتی ہے اپنے حال پہ شبنم کبھی کبھی
ہو کر ترے خیال کی رنگینیوں میں گم

خود بن گیا ہوں حسنِ مجسّم کبھی کبھی
کیف و نشاطِ درد کا عالم نہ پوچھیے

ہنس کر گزار دی ہے شبِ غم کبھی کبھی
اُن کی خوشی کو اپنی خوشی جان کر شکیل

سر کر لیا ہے معرکہ غم کبھی کبھی

اب تو ہر عنوانِ عیش و غم سے جی گھبرا گیا
زیست کے افسانۂ مبہم سے جی گھبرا گیا

سوزِ عشق و گریۂ پیہم سے جی گھبرا گیا
ارتباطِ شعلۂ و شبنم سے جی گھبرا گیا
کوئی دیکھے تو ذرا یہ طرزِ تنظیم حیات
پھر وہی عالم کہ جس عالم سے جی گھبرا گیا
اب تجھی پر منحصر ہے فیصلہ برقِ جمال
چشم و دل کی چشمک باہم سے جی گھبرا گیا
سعئ تکمیلِ محبت تو بجا ہے اے شکیل
اور اگر ناکامئ پیہم سے جی گھبرا گیا

دل کی نظر سے اہلِ نظر دیکھتے نہیں
منزل ہے زیرِ گام مگر دیکھتے نہیں
کیا پوچھتے ہو تمکنتِ عیش کا مآل
یہ اہتمامِ برق و شرر دیکھتے نہیں
طاری نگاہ و دل پہ ہے اِک مرگِ بیخودی
شاید وہ کچھ دنوں سے ادھر دیکھتے نہیں
دل دادگانِ سوزِ محبت خدا گواہ

بجھتے ہوئے چراغ سحر دیکھتے نہیں

ناصح نظر شناس نہیں ہم تو کیا ملال
جو دل کو دیکھتے ہیں نظر دیکھتے نہیں

تھا دل کو سکوں عشق جنوں گیر سے پہلے
گردش ہی نہ تھی گردش تقدیر سے پہلے

اب قیمت یک موج نفس ہو گئی معلوم
کچھ بھی تو نہ تھا آہ میں تاثیر سے پہلے

اے سایۂ دامان کرم ڈھونڈنے والو!
انجام بھی سوچا کبھی تقصیر سے پہلے

دنیا مری تصویر پہ بے کار ہے ناقد
دنیا ہی کہاں تھی مری تصویر سے پہلے

یہ محفل رنداں ہے یہاں حضرت واعظ
عنوان بتا دیجئے تقریر سے پہلے

دُور ہیں وہ اور کتنی دُور
پھر بھی مری نظروں کے حضور
رنج و مصیبت جور و ستم
آپ کی خاطر سب منظور
دل پر بیتے لب پہ نہ آئے
ہائے محبّت کا دستور
حسرتِ دیدار دید بلند
حور سے بہتر وعدۂ نور
پردۂ رنگ و بو تو اٹھا
ہو گا کوئی نہ کوئی ضرور
دَورِ ترقی کیا ہے شکیل
دُنیا کی عقلوں کا فتور

میری دیوانگی نہیں جاتی
رو رہا ہوں ہنسی نہیں جاتی
تیرے جلووں سے آشکار ہوں میں

چاند کی چاندنی نہیں جاتی

ترک مے ہی سمجھ اسے ناصح
اتنی پی ہے کہ پی نہیں جاتی

جب سے دیکھا ہے ان کو بے پردہ
نخوتِ آگہی نہیں جاتی

شوخیٔ حسن بے اماں کی قسم
حسن کی سادگی نہیں جاتی

اُن کی دریا دلی کو کیا کہیئے
میری تشنہ لبی نہیں جاتی

تصوّر میں ان سے ملاقات کیوں ہو
نظارہ بقیدِ حجابات کیوں ہو

نظر وقفِ شکر شکایات کیوں ہو
انہیں جس سے ضد ہے وہی بات کیوں ہو

مجھے ظلمتِ ہجر پر ہے تعجب
جہاں دن نہ نکلے وہاں رات کیوں ہو

وہ خود بھی ہیں جرمِ محبت میں شامل
خطا وار تنہا مری ذات کیوں ہو
غریبِ وفا وعدہ ہائے مسلسل
مجھی پر یہ مشقِ عنایات کیوں ہو

مری زندگی ہے ظالم ترے غم سے آشکارا
ترا غم ہے در حقیقت مجھے زندگی سے پیارا
وہ اگر برا نہ مانیں تو جہانِ رنگ و بو میں
میں سکونِ دل کی خاطر کوئی ڈھونڈلوں سہارا
مجھے تجھ سے خاص نسبت میں رہینِ موج طوفاں
جنہیں زندگی تھی پیاری انہیں مل گیا کنارا
مجھے آگیا یقیں سا کہ یہی ہے میری منزل
سرِ راہ جب کسی نے مجھے دفعتاً پکارا
یہ خنک خنک ہوائیں یہ جھکی جھکی گھٹائیں
وہ نظر بھی کیا نظر ہے جو سمجھ نہ لے اشارا
میں بتاؤں فرق ناصح جو ہے مجھ میں اور تجھ میں

مری زندگی تلاطم تری زندگی کنارا

مجھے فخر ہے اسی پر یہ کرم بھی ہے مجھی پر
تری کم نگاہیاں بھی مجھے کیوں نہ ہوں گوارا

مجھے گفتگو سے بڑھ کر غمِ اذنِ گفتگو ہے
وہی بات پوچھتے ہیں جو نہ کہہ سکوں دوبارا

کوئی اے شکیل دیکھے یہ جنوں نہیں تو کیا ہے
کہ اسی کے ہو گئے ہم جو نہ ہو سکا ہمارا

آنکھ ان کو دیکھتی ہے نظارا کئے بغیر
پردہ میں چھپ گئے ہیں وہ پردہ کئے بغیر

ہر چند دردِ عشق کا درماں نہیں مگر
بنتی نہیں ہے فکر مداوا کئے بغیر

زاہد سے پوچھئے غمِ دنیا کی عظمتیں!
عقبیٰ نہ مل سکی غمِ دنیا کئے بغیر

جاتے ہیں دل میں چھوڑ کے وہ جلوۂ خیال
بجھتی ہے شمع گھر میں اندھیرا کئے بغیر

اکثر تو دل گرفتگیٔ شوق کی قسم!
مجھ تک وہ آ گئے ہیں ارادہ کئے بغیر
ہم کو بھی دیکھنا ہے کہ یہ منکرینِ عشق
کب تک رہیں گے تیری تمنا کئے بغیر
شعر و ادب کی راہ میں ہوں گامزن شکیلؔ
اپنے مخالفین کی پروا کئے بغیر

دید کے حوصلے ہیں گم جلوہ حُسن ذات میں
دخل نگاہ کچھ نہیں دل کے معاملات میں
دل سے نہ قطع راہ کر، دل کی طرف نگاہ کر
دیکھ یہ وسعتیں کہاں دامن کائنات میں
جرأت شکوہ بھی نہیں جن کے حضور بار یاب
ہیں وہ ستم چھپے ہوئے پردۂ التفات میں
فیضِ جنوں سے مٹ گیا خلوت و انجمن کا فرق
حشر بپا ہے آج کل بزمِ تصورات میں
حسن و نظر کی کشمکش ختم ہوئی نہ تھی ہنوز

دل بھی اُلجھ کے رہ گیا دامِ تجلّیات میں

شکوۂ غم نہ کر شکیلؔ حُسن مآل کو بھی دیکھ

ہے کوئی مصلحت ضرور اُنکی ہر ایک بات میں

فزوں اتنا تو ذوقِ جستجوئے یار ہو جائے

نگاہیں ڈھونڈتی رہ جائیں اور دیدار ہو جائے

سُنا ہے آرہے ہیں خود وہ پیغامِ سکوں بن کر

زمانہ رُخ بدلنے کے لئے تیّار ہو جائے

وہ تجدیدِ محبت کے لئے بیتاب ہیں اَے دل

مزہ جب ہے تری جانب سے اب انکار ہو جائے

محبت کی وہ منزل بھی عجب نازک سی منزل ہے

جہاں اندازۂ لطف و ستم دشوار ہو جائے

بس اب آجا کہ آنکھوں میں ہے خوابِ مرگ تنہائی

ترے آنے سے شاید زندگی بیدار ہو جائے

شکیلؔ اس کے سوا کیا مُدعا تخلیقِ ہستی کا

محبت زندگی سے برسرِ پیکار ہو جائے

نہ اب وہ آنکھوں میں برہمی ہے نہ اب وہ ماتھے پہ بل رہا ہے
وہ ہم سے خوش ہیں ہم ان سے خوش ہیں زمانہ کروٹ بدل رہا ہے

خوشی نہ غم کی نہ غم خوشی کا عجیب عالم ہے زندگی کا
چراغِ افسردۂ محبّت نہ بجھ رہا ہے نہ جل رہا ہے

اہانتِ چشمِ مست ہے یہ کہ ہوش چھا جاتے بے خودی پر
نظر اُٹھا کر تو دیکھ ساقی یہ کون گر کر سنبھل رہا ہے

ہزار ترکِ وفا کروں میں تری محبت کو کیا کروں میں
دلِ حزیں تجھ سے رُوٹھ کر بھی ترے اشاروں پہ چل رہا ہے

یہ کالی کالی گھٹا یہ ساون فریبِ زاہد الہٰی توبہ!
وضو میں مصروف ہے بظاہر حقیقتاً ہاتھ مل رہا ہے

نہیں ہیں دیپک کے راگ سے کم محبتوں کے گداز نغمے
جو سُن رہا ہے وہ پھک رہا ہے جو گا رہا ہے وہ جل رہا ہے

کہاں یہ ہستی کی واردات کہاں یہ عیش و طرب کی باتیں
اب اور ہی نغمہ چھیڑ مطرب کہ رنگِ محفل بدل رہا ہے

شکیل تفسیرِ شعر اپنی جو پوچھتے ہو تو بس اتنی!
جو نالہ سینہ میں گھٹ رہا تھا وہ نغمہ بن کر نکل رہا ہے

غمِ حیات بھی آغوشِ حسنِ یار میں ہے
یہ وہ خزاں ہے جو ڈوبی ہوئی بہار میں ہے

اثر شراب کا عہد وفائے یار میں ہے
قدم قدم پہ جو لغزش سی اعتبار میں ہے

شگفتگیٔ دل کارواں کو کیا سمجھے
وہ اک نگاہ جو الجھی ہوئی غبار میں ہے

شکستِ حوصلۂ ضبطِ غم مجھے منظور
چلے بھی آؤ کہ دل کب سے انتظار میں ہے

یہ اضطراب کا عالم یہ شوقِ بے پایاں
شکیلؔ آج بلاشبہ کوئے یار میں ہے

روح کو تڑپا رہی ہے اُن کی یاد
درد بن کر چھا رہی ہے اُن کی یاد

عشق سے گھبرا رہی ہے اُن کی یاد
رُکتے رُکتے آ رہی ہے اُن کی یاد

وہ ہنسے وہ زیرِ لب کچھ کہہ اُٹھے

خواب سے دکھلا رہی ہے اُن کی یاد
میں تو خود داری کا قائل ہوں مگر
کیا کروں پھر آ رہی ہے اُن کی یاد
اب خیال ترکِ ربط و ضبط سے
خود بہ خود شرما رہی ہے اُن کی یاد

فرقت میں ہوں جینے کی دعاؤں سے حزیں اور
اس قید کی میعاد نہ بڑھ جائے کہیں اور
لب صرف تکلّم ہیں تو نظریں ہیں کہیں اور
ان باتوں سے ہوتا ہے محبّت کا یقیں اور
مغرور ہوئے جاتے ہیں تنکے بھی چمن میں
اے برق ذرا میرے نشیمن کے قریں اور
مسجد کے ارادے سے نکلتے تو ہیں زاہد
لیکن انہیں جاتے ہوئے دیکھا ہے کہیں اور
وہ مہلتِ اظہارِ تشکر نہیں دیتے
کچھ اس کے سوا اُن سے شکایت ہی نہیں اور

ہے ترکِ محبت کا شکیلؔ اب تو یہ عالم
وہ جتنا بھلاتا ہوں وہ ہوتے ہیں قریں اور

کیوں نہ تقدیر پہ ہو نازِ دو عالم آج کی رات
سن رہے ہیں وہ مرا قصۂ غم آج کی رات

اُٹھ گئی میری طرف چشمِ کرم آج کی رات
چھپ گئے دامنِ فردا میں ستم آج کی رات

بدگمانی سی ہوئی جاتی ہے یقین در آغوش
کھا رہے ہیں وہ محبت کی قسم آج کی رات

سوچتا ہوں میں بہ ایں عالمِ فردوسِ خیال
کیا ہوئی شدتِ احساسِ الم آج کی رات

نگہِ لطفِ مسیحا سے بھی تسکیں نہ ہوئی
درد پہلے سے زیادہ ہے نہ کم آج کی رات

خرد کو آزمانا چاہتا ہوں
جنوں کی زد پہ آنا چاہتا ہوں

جو تھی حاصل تری محفل سے پہلے
اسی خلوت میں جانا چاہتا ہوں
نہ ہوں جس میں نمایاں حال و ماضی
کوئی ایسا زمانا چاہتا ہوں
جفا و رنج و لطف و شادمانی
میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں
تری خاطر جنہیں بیگانہ سمجھا
اُنہیں اپنا بنانا چاہتا ہوں
جنونِ منتقم ہشیار ہو جا
اُنہیں ہنس کر رُلانا چاہتا ہوں
نہیں خواہش مجھے کون و مکاں کی
نگاہِ مخلصانہ چاہتا ہوں
محبت پر پئے ترکِ محبّت
کوئی تہمت لگانا چاہتا ہوں

نہ خیال مرگ وہستی نہ ملالِ عمرِ فانی
مرا مدعا محبّت مری آرزو جوانی

وہی کیفِ بے نہایت وہی لطف و شادمانی
تری عشرتوں پہ صدقے مری تلخ زندگانی

جو بھڑک اُٹھے یہ شعلے تو مجھے بھی پھونک دینگے
مرا قصۂ محبت نہ سنو مری زبانی

مرے دل کا ساتھ دیتی مری زندگی کہاں تک
مجھے ہوش آرہا تھا کہ گذر گئی جوانی

میں کروں تو شکوۂ غم مگر اے یقینِ محکم!
مجھے بے زباں نہ کردے کہیں انکی بے زبانی

عروجِ فطرتِ آدم کو رسوا کر رہا ہوں میں
خدا کو بھول کر انساں کو سجدہ کر رہا ہوں میں

سکون وعیش کے ساماں مہیا کر رہا ہوں میں
حیاتِ چند روزہ پر بھروسہ کر رہا ہوں میں

ترے پردے میں خود اپنی تمنا کر رہا ہوں میں

ارے توبہ محبّت کو بھی رسوا کر رہا ہوں میں

غرورِ بے نیازی خود نمائی و خود آرائی
جو تجھ میں ہیں وہی انداز پیدا کر رہا ہوں میں
بجا ترکِ وفا کی کوششیں لیکن تعجب ہے
یہ بے جا زحمتیں کیونکر گوارا کر رہا ہوں میں

نگاہِ شوق پہ کرنا ہے آشکار مجھے
وہ ایک راز جو سمجھا گئی بہار مجھے
فریبِ وعدۂ فردا کو جانتا ہوں مگر
میں کیا کروں اگر آ جائے اعتبار مجھے
ہنوز تشنۂ تکمیل ہے مذاقِ الم
شکستِ دل کی صدا بن کے پھر پکار مجھے
زمانہ ترکِ محبّت کو ہو گیا لیکن
سنا رہی ہے خلش کوئی بار بار مجھے
نگاہِ قہر کی محبوب تلخیوں کی قسم!
نگاہِ لطف بھی آئی نہ سازگار مجھے

عقل نے سزا پائی شرحِ رنگ بو کر کے
یعنی خود کو کھو بیٹھے اُن کی جستجو کر کے

وہ بھی دل گرفتہ ہیں اپنی کیا کہوں ناصح
مجھ سے گفتگو کرنا اُن سے گفتگو کر کے

اِک جنونِ بے معنی اک یقینِ لا حاصل
اور کیا ملا ظالم تیری آرزو کر کے

آرزو لرزتی تھی جن کا نام بھی سُن کر
اُن کو پا لیا ہم نے ترکِ آرزو کر کے

صبح کا افسانہ کہہ کر شام سے
کھیلتا ہوں گردشِ ایام سے

اُن کی یاد اُن کی تمنا اُن کا غم
کٹ رہی ہے زندگی آرام سے

عشق میں آئیں گی وہ بھی ساعتیں
کام نکلے گا دلِ ناکام سے

لاکھ میں دیوانہ و رسوا سہی

پھر بھی اک نسبت ہی تیرے نام سے
صبحِ گلشن دیکھئے کیا گل کھلائے
کچھ ہوا بدلی ہوئی ہے شام سے
ہائے میرا ماتمِ تشنہ لبی
شیشہ مل کر رو رہا ہے جام سے
بیخودی پر شاید اُن کا بس نہیں
ہوش آ جاتا ہے اُن کے نام سے
ہر نفس محسوس ہوتا ہے شکیلؔ
آ رہے ہیں نامہ و پیام سے

کچھ اس قدر تو فزوں شوقِ دیدیار رہے
وہ سامنے ہوں مگر اُن کا انتظار رہے
نظر کو شرکتِ نظارہ کی بھی تاب نہیں
بس آج ہم رہیں گلشن میں یا بہار رہے
خوشا یہ عفوِ مسلسل زہے یہ رحمتِ عام
گناہگار کہاں تک گناہگار رہے

خزاں کے دم سے ہے قائم چمن کی رعنائی
اُجڑ ہی جائے اگر مستقل بہار رہے
مآلِ خندۂ گل پر نکل پڑیں آنسو
اگر نگاہِ پسِ پردہ بہار رہے

مسرت دُور رہتی ہے تو دل کو غم نہیں ہوتا
عجب ہوتا ہے عالم جب کوئی عالم نہیں ہوتا
مرے حُسنِ یقیں میں عجز شامل ہوتا جاتا ہے
میں قرباں ایسے وعدے پر جو مستحکم نہیں ہوتا
سُن اے گیرائی رحمت پہ چھینٹے پھینکنے والے
تجھے معلوم ہے دریا کبھی شبنم نہیں ہوتا
ستم ہے داستانِ لغزشِ آدم کی رُسوائی
کبھی محفل میں ذکرِ عظمتِ آدم نہیں ہوتا
اگر اُن کی نظر آمادۂ مہر و وفا ہوتی
تو مجھ کو شکوۂ بے مہریِ عالم نہیں ہوتا
وہی کیفِ نشاط آگیں وہی رعنائی پنہاں
مذاقِ عشق حُسنِ یار سے کچھ کم نہیں ہوتا

بہت کچھ ہو چکی ہیں زندگی میں خامیاں پیدا
ضرورت ہے نئے سر سے ہو پھر بزم جہاں پیدا
تغافل در نظر پنہاں شکایت بر زباں پیدا
یہ کیا شے ہو گئی ہے میرے ان کے درمیاں پیدا
چمن میں رونق فصلِ بہاراں دیکھنے والے
چمن ہی کے کسی گوشہ سے ہوتی ہے خزاں پیدا
تعجب ہے وہ کیوں کر زندگی کو منہ دکھاتے ہیں
جو دُنیا میں ہوئے جینے کو بے نام و نشاں پیدا
وہ ناکام محبت ہوں جسے باوصفِ رُسوائی
کوئی ہمدم میسّر ہے نہ کوئی رازداں پیدا

بعنوان خوشی رازِ محن کہنا ہی پڑتا ہے
ترے صدقے بیاباں کو چمن کہنا ہی پڑتا ہے
محبت کو حدیثِ جان و تن کہنا ہی پڑتا ہے
سخن کہیے تو موضوعِ سخن کہنا ہی پڑتا ہے
حکایاتِ خردمندانہ سُن کر ناصحا تجھ سے

فروغِ عقل کو دیوانہ پن کہنا ہی پڑتا ہے

یہ اعلانِ تقدس اور یہ مے خواریاں واعظ
تجھے منجملۂ اربابِ فن کہنا ہی پڑتا ہے

مذاقِ دید کی اس جلوہ سامانی کو کیا کہیئے
نظر کی خلوتوں کو انجمن کہنا ہی پڑتا ہے

بدایوں میں شکیلؔ ان مختصر لمحوں سے کیا حاصل
وطن میں آکے خود کو بے وطن کہنا ہی پڑتا ہے

جام گردش میں ہے ور بند ہیں میخانوں کے
کچھ فرشتے ہیں یہاں روپ میں انسانوں کے

شمع کی آگ میں دل جلتے ہیں پروانوں کے
حوصلے دیکھیئے ان سوختہ سامانوں کے

صرف تشہیر ہے شاید مرا افسانۂ غم
آج احباب میں انداز ہیں بیگانوں کے

لذتِ خواب سے بیگانہ ہیں ماہ و انجم
سننے والے ہیں یہ شاید مرے افسانوں کے

فصلِ گل رنگِ چمن دورِ خزاں حسنِ بہار
مختلف نام ہیں ساقی ترے پیمانوں کے
اے مرے ناصحِ خوش فہم ذرا غور سے سُن
دوست ناداں ہوا کرتے ہیں نادانوں کے
چُن لیا ہے جنہیں گردوں نے سمجھ کر تارے
ہیں شکیلؔ آہ یہ ٹکڑے مرے ارمانوں کے

رفعت خیال میں ہے نہ وسعت نظر میں ہے
محدود حُسنِ یار دلِ بے خبر میں ہے
برگشتگیٔ قسمتِ واعظ نظر میں ہے
سب میکدے اور وہ بیچارہ گھر میں ہے
منزل کو پا کے بھی نہ قدم مطمئن ہوئے
کس درجہ پختگی مرے عزمِ سفر میں ہے
دیرینہ غفلتوں کو ذرا یاد کر کے دیکھ
اِک شخص اجنبی سا تری رہ گذر میں ہے
وہ طالبانِ دید کو کیوں مطمئن کریں

جلووں کی آبرو ہی شکستِ نظر میں ہے

بیٹھا ہوں سر جھکائے ہوئے اُن کی بزم میں
شاید مری نظر بھی ہجومِ نظر میں ہے
دُنیا نہ جس کو دیکھ سکی آج تک شکیلؔ
مُجھ کو یہ ناز ہے کہ وہ میری نظر میں ہے

دل غمِ جاناں سے لذّت آشنا ہونے کو ہے
کافرانہ زندگی کی ابتدا ہونے کو ہے

خانۂ اُمید بے نور و ضیا ہونے کو ہے
چشمِ تر سے آخری آنسو جُدا ہونے کو ہے

یہ بھی اے دل اک فریبِ وعدۂ فردا نہ ہو
روز سنتا ہوں کوئی محشر بپا ہونے کو ہے

پھر بہار و برق کی ہیں گل کدے پر یورشیں
پھر چمن میں عنقریب اک سانحہ ہونے کو ہے

دُور ہوں لیکن بتا سکتا ہوں اُن کی بزم میں
کیا ہوا کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے کو ہے

کھل رہی ہے آنکھ اِک کافر حسیں کی صبحدم
مے کشو مژدہ درِ میخانہ وا ہونے کو ہے
ترکِ الفت کو زمانہ ہو گیا لیکن شکیل
آج پھر میرا اور اُن کا سامنا ہونے کو ہے

دل کو شبِ غم لطفِ شبینہ ہی نہ آیا
مر مر کے ترے ہجر میں جینا ہی نہ آیا
آغوشِ تلاطم میں سفینہ ہی نہ آیا
ناصح کو محبت کا قرینہ ہی نہ آیا
جب سے مرے ساقی کی توجہ نہیں مجھ پر
واللہ کہ ساون کا مہینہ ہی نہ آیا
میخانہ در آغوش ہے ہر منظرِ فطرت
نا محرمِ فطرت تجھے پینا ہی نہ آیا
اِک بار تو اٹھی تھیں وہ نظریں مری جانب
پھر تذکرۂ ساغر و مینا ہی نہ آیا
جلوے تو شکیل اُن کے ضیا بار تھے لیکن
کام آج مرا دیدۂ بینا ہی نہ آیا

مزاج دوست کے سانچے میں ڈھلتا جاتا ہے
قدم قدم پہ زمانہ بدلتا جاتا ہے

خلافِ مصلحت و آگہی ہیں جو راہیں
دلِ حزیں انہیں راہوں پہ چلتا جاتا ہے

وہی ہو تم - وہی میں ہوں - وہی فسانہ مگر
یہ کیا ستم ہے کہ عنواں بدلتا جاتا ہے

نہ جانے کیوں مری رودادِ عیش رفتہ میں
غمِ حیات کا پہلو نکلتا جاتا ہے

اگر نہیں کوئی در پردہ رند کے ہمراہ
تو کیا سبب ہے کہ گر کر سنبھلتا جاتا ہے

گمان ترکِ وفا ہے ترے تغافل پر
زمانہ وقت سے پہلے بدلتا جاتا ہے

ضرور رقصِ شرر ہے فریبِ عقل و نظر
خوشی خوشی جو یہ پروانہ جلتا جاتا ہے

میں اے شکیلؔ زمانے کے ساتھ کیوں جاؤں
زمانہ خود ہی مرے ساتھ چلتا جاتا ہے

ہزار قیدِ خزاں سے چھٹ کر بہار کا آسرا کرینگے
بہار بھی ہم قفس زدوں کو نہ راس آئی تو کیا کرینگے
اب اور اس کے سوا نہ ہوگی قفس میں تسکینِ دل کی صورت
چمن کی جانب نظر اٹھا کر کبھی کبھی ہنس لیا کرینگے
یہ کیا خبر تھی کہ شامِ فرقت مرے لئے سازگار ہوگی
وہ ماہ و انجم کی آڑ لے کر مرے فسانے سنا کرینگے
ہمارے مشرب میں تھی نہ جائز ورِ حرم کی جبہ سائی
یہ فرضِ ناخوشگوار لیکن اب ان کی خاطر ادا کرینگے
نگاہ کی بندشیں سلامت، جنوں کی پابندیاں مسلّم
کہیں بھرم کھل گیا تو اے دل میں کیا کرونگا وہ کیا کرینگے
یہ دیکھنا ہے کہ بعد ترکِ تعلقات اے شکیل کب تک
نہ کوئی ہم پر جفا کرے گا نہ ہم کسی سے وفا کرینگے

موسمِ گل ساتھ لے کر برق و دام آ ہی گیا
یعنی اب خطرے میں گلشن کا نظام آ ہی گیا
جستجو، جس پر تصدّق وہ مقام آ ہی گیا

اپنی منزل سے میں آگے چند گام آ ہی گیا
وہ نگاہِ مست اُٹھی گردش میں جام آ ہی گیا
یعنی وقتِ امتیازِ خاص و عام آ ہی گیا

جو اٹھا کرتے تھے اظہارِ تقدس کے لئے
اُن لرزتے کانپتے ہاتھوں میں جام آ ہی گیا

نور و ظلمت پر تبسّم کفر و دیں پر قہقہے
زندگی کو نشۂ عمرِ دوام آ ہی گیا

پاسباں کرتے رہے سرگوشیاں ہی اور میں
اُن کی محفل سے بہ عزّ و احترام آ ہی گیا

جانے کن نظروں سے دیکھا آج ساقی نے مجھے
میں تو یہ سمجھا کہ مجھ تک دورِ جام آ ہی گیا

اب اسی کو زندگی کہہ لیجئے یا صبحِ مرگ
آنکھ کھولی تھی کہ سر پر وقتِ شام آ ہی گیا

ترکِ مے کو مدّتیں گذری ہیں لیکن محتسب
ساقئ مہوش اگر آتش بہ جام آ ہی گیا

ہائے یہ عالم کہ اب ترکِ وفا کے بعد بھی

دل میں ہوک اُٹھی نہ اُٹھی، لب پہ نام آ ہی گیا
لذّتِ رنگینیٔ اشعار کیا کہیئے شکیلؔ
کچھ نہ کچھ احباب کو لطفِ کلام آ ہی گیا

قطعات

جو ایک نظر کی جنبش سے سب دل کی بستی لوٹ گیا
وہ جس سے آنکھیں چار ہوئیں اور ہاتھ سے ساغر چھوٹ گیا
دل اُس کا بھی ہے میرا بھی ہے فرق شکیلؔ اتنا لیکن
وہ پتھر ہے جو ثابت ہے یہ شیشہ تھا جو ٹوٹ گیا

وہ گرمیٔ بزمِ عشق گئی وہ مہر و وفا کے گیت گئے
جب حوصلۂ دل پست نہ تھا ہاں ہاں وہ زمانے بیت گئے
ہم شانِ تحمّل پر نازاں تم جورِ مسلسل پر قائم
ﷲ یہ بازی رہنے دو، ہم ہار گئے تم جیت گئے

پھر دل سرِ راہِ عشق و وفا بے جرأت و بے اسلوب گیا
اس منزل میں ہر صاحبِ دل محجوب آیا مجحوب گیا
اُف بحرِ محبّت بے پایاں وہ بحرِ محبّت ہے جس میں
اِک ڈوبنے والا تیر گیا اک تیرنے والا ڈوب گیا

پُر کیف بہاریں آ نہ سکیں پُر لطف نظارے ہو نہ سکے
دورِ مئے رنگیں چل نہ سکا فطرت کے اشارے ہو نہ سکے
عالم بھی وہی ہے دل بھی وہی تقدیر کو لیکن کیا کہیئے!
ہم آپ کے تھے، ہم آپ کے ہیں، ہاں آپ ہمارے ہو نہ سکے

اِنسان کی فطرت کیا کہیئے مشکل سا فسانہ ڈھونڈھ لیا
ٹھکرا کے جمودِ ہستی کو جینے کا بہانہ ڈھونڈھ لیا
احساسِ محبّت کیا معنی بیباک جرأت کیا معنی؟
تقصیر کے نازک پردے میں آدم نے ٹھکانا ڈھونڈھ لیا

نظمیں

چور

موسمِ سرما کی کچھ کچھ ہو چلی تھی ابتدا
شہر پر چھائی ہوئی تھی رات کی کالی گھٹا
درمیانی حصّۂ شب تھا فضا خاموش تھی
ساری خلقت کیفِ خوابِ ناز سے مدہوش تھی
یا تو پہرہ دار چلاّتے تھے، جاگو چور، چور
یا کبھی کتوں کی آوازوں سے ہو جاتا تھا شور
یا فضا میں گونج اٹھتی تھی ضعیفوں کی کھنکار
ٹوٹ جاتا تھا غرض اس طرح خاموشی کا تار
ہر عمارت ہر در و دیوار ہر اک رہگذر
بن گئی تھی ہمسرِ شہرِ خموشاں سر بہ سر
پاس کی تحصیل میں بارہ کا جب گھنٹہ بجا
چور اپنی چارپائی سے یکایک اٹھ گیا
گھر سے باہر آ کے اک جانب روانہ ہو گیا
مختصر طولِ شبِ غم کا فسانہ ہو گیا

چل دیا بے روزگاری کو مٹانے کے لئے
لعنتِ سرمایہ داری کو مٹانے کے لئے

جا رہا تھا جیسے اِک دریا میں بیتابانہ موج
پستیاں تھیں مائل پرواز گویا تا بہ اوج

اس کے چہرے سے مسرت کی جھلک تھی آشکار
اس کی نظریں جستجوئے شوق کی آئینہ دار

بڑھ رہا تھا جوشِ تکمیلِ تمنّا دم بہ دم
اٹھ رہا تھا تیز رفتاری سے اس کا ہر قدم

اِک دلیرانہ ادا سے دل کو سمجھاتا ہوا
شاہرہ کو چھوڑ کر گلیوں میں کتراتا ہوا

ایک بے حد خوشنما کوٹھی میں داخل ہو گیا
کاروانِ آرزو نزدیکِ منزل ہو گیا

چور کی حالت یہاں ناقابلِ اظہار تھی
اس کو ہر لحظہ خود اپنے دل کی دھڑکن بار تھی

کر رہا تھا مضطرب انساں کو انسانوں کا خوف
یعنی اُس رنگیں عمارت کے نگہبانوں کا خوف

لیکن اِک دُھن میں اُسے سب خدشے منظور تھے
حوصلہ محفوظ تھا، پھر بھی قدم معذور تھے
دائیں بائیں دیکھ کر کچھ بیٹھ جاتا تھا کبھی
اُٹھ کے پھر اپنے کئے پر مسکراتا تھا کبھی
آخر کار آ ہی پہنچا اِک کھلی کھڑکی کے پاس
اُس پہ چڑھ کر آ گیا اندر بصد خوف و ہراس
کچھ نہ پوچھو کیا وہاں جا کر نظر آیا اُسے
حُسن خوابیدہ کا اِک منظر نظر آیا اُسے
نیلے نیلے بلب کی وہ ہلکی ہلکی روشنی
جیسے اِک صحن چمن میں چاندنی چھٹکی ہوئی
تھا یہ کمرہ اک نمونہ گوشۂ فردوس کا
جس میں صرف خواب تھی اک مہ جبین و مہ لقا
وہ سراپا مطلع انوار حُسن لاجواب
چرخ سے گویا اتر کر آ گیا تھا ماہتاب
وہ مکمّل حُسن از سر تا بہ پا مست شباب
وہ مجسّم برق سرکائے ہوئے رُخ سے نقاب

اُس کی صورت تھی مکمل ایک صورت نور کی
دیکھنے والے کے حق میں جیسے بجلی طور کی

مٹ گئیں ساری امیدیں اِک ہزیمت خورکی
انقلابِ عزم نے دنیا بدل دی چور کی

دستِ بے قابو سے اب دامانِ ہمت چھٹ گیا
لوٹنے والا خود اِک ظالم کے ہاتھوں لُٹ گیا

حاصلِ ذوقِ نظر تھیں حیرتیں ہی حیرتیں
اِک تماشہ بن کے دل پہ چھا گئی تھیں غیرتیں

اس طرف غرقِ ندامت دیدۂ پُر آب تھا
اُس طرف اِک پیکرِ معصوم محوِ خواب تھا

اس طرف محشر بداماں عشق کی پرچھائیاں
اُس طرف جنت بداماں حُسن کی رعنائیاں

اس طرف اِک آن میں ہر حوصلہ گم ہو گیا
اُس طرف اِک فتنہ گر فتنے جگا کر سو گیا

بیخودیٔ شوق میں پڑنے لگے اُلٹے قدم
آ گیا کھڑکی سے باہر چور باجاہ و حشم

کیا چرانے کو گیا تھا کیا چرا کر لے چلا
دیدۂ حیرت میں اک جلوہ چرا کر لے چلا
اس کو ساری دولتوں سے بڑھ کے دولت مل گئی
مال و زر لینے کو آیا تھا محبّت مل گئی

تصادم

وہ صدر رشکِ جنّت وہ گلزار دہلی
وہ مجموعۂ حسن و انوار دہلی
وہ دہلی جو فردوسِ ہندوستان ہے
وہ دہلی کہ جس کی زمیں آسماں ہے
وہی جس نے دیکھے ہیں لاکھوں زمانے
سُنے ہیں بہت انقلابی فسانے
جہاں دفن ہیں سینکڑوں تاج والے
وہ روزِ حکومت کی معراج والے
جہاں شمع جلتی ہے دھیمی سی ضو کی

جہاں جلوہ ریزی ہے تہذیبِ نو کی
وہیں کی یہ دل دوز روداد سُنیئے
بیانِ الم ذکرِ بیداد سُنیئے
شفق سہ پہر کی ٹھکانے لگی تھی
سیاہی فضاؤں پہ چھانے لگی تھی
دکھانے کو تھا جلوہ حُسنِ مکمل
اُٹھانے کو تھا رُخ سے مہتاب آنچل
فلک پر ستارے چمکنے لگے تھے
محبت کے مارے بہکنے لگے تھے
اُدھر نور تھا، آسماں کی جبیں پر
اِدھر ہر طرف دلکشی تھی زمیں پر
وہ بازار کی خوشنما جگمگاہٹ
وہ گوش آشنا چلنے پھرنے کی آہٹ
سرِ راہ وہ بجلیوں کی بہاریں
دکانات کی وہ دو رویہ قطاریں
یہ منظر بھی تھا کِس قدر کیف ساماں

خدا کی خدائی تھی جنّت بداماں
سڑک پر کوئی رہرو کوئے جاناں
چلا جا رہا تھا خراماں خراماں
کسی خاص عالم میں کھویا ہوا سا
خیالوں کے دریا میں ڈوبا ہُوا سا
کشادہ جبیں پر وہ آثارِ عظمت
نظر دے رہی تھی نویدِ محبّت
اِدھر راہ پر نوجواں جا رہا تھا
اُدھر ایک موٹر چلا آ رہا تھا
یہ گاڑی نہ تھی جو چلی آ رہی تھی
حقیقت میں جنّت کھنچی آ رہی تھی
کوئی کیا بتائے کہ جنّت میں کیا تھا
وہی تھا جو اب تک نہ دیکھا ہوا تھا
وہ حُسنِ مکمل وہ برقِ مجسّم
وہ جس کے تصوّر سے بھی دور ہو غم
وہ اک پیکرِ سادگی اللہ اللہ!

وہ نازک لبوں پر ہنسی اللہ اللہ
سراپا محبت سراپا جوانی
ستم اُس پہ ساڑی کا رنگ آسمانی
وہ رہ رہ کے آنچل اٹھانے کا عالم
وہ ہنس ہنس کے موٹر چلانے کا عالم
یہ عالم بظاہر فریبِ نظر تھا
کہ بس ایک لمحے میں رنگِ دگر تھا
نہ بشاش چہرہ نہ لب پر تبسّم
سکوت آشنا تھی ادائے تکلّم
گراں باریاں دل کو برما گئی تھیں
نگاہوں پہ تاریکیاں چھا گئی تھیں
ہوئے صنفِ نازک کے ہوش و خرد گم
زباں نے پکارا تصادم تصادم
یہ منظر بھی تھا کس قدر وحشت افزا
کہ موٹر سرِ راہ ٹھہرا ہوا تھا
دگرگوں تھی حالت تماشائیوں کی

خبر تھی انہیں دل کی گہرائیوں کی

اِدھر نوجواں خوں بداماں پڑا تھا

اِدھر ایک معصوم قاتل کھڑا تھا

اِدھر رُوح عزمِ سفر کر چکی تھی

اِدھر دل پہ وحشت اثر کر چکی تھی

اِدھر موت خود زندگی اصل میں تھی

اُدھر زندگی موت کی شکل میں تھی

غرض کھل گئی اصلیت حادثے کی

ہوئی مرنے والے کی جامہ تلاشی

پسِ جیب قاتل کی تصویر نکلی

علاوہ ازیں ایک تحریر نکلی

تسلّی ہوئی جان میں جان آئی

جو پرچہ پہ لکھی عبارت یہ پائی

جفائے مسلسل سے چکرا گیا تھا!

میں خود جا کے موٹر سے ٹکرا گیا تھا!

نمائش علی گڈھ

شفق نزع میں لے رہی تھی سنبھالا
اندھیرے کا غم کھا رہا تھا اُجالا
ستاروں کے رُخ سے نقاب اُٹھ رہی تھی
فضاؤں سے موجِ شباب اُٹھ رہی تھی
مئے زندگی جامِ مئے نوش میں تھی
نمائش علی گڈھ کے آغوش میں تھی
وہ کیفِ مسرّت وہ لمحاتِ رنگیں
وہ احساسِ مستی وہ جذباتِ رنگیں
وہ پُرکیف عالم وہ دلکش نظارے
وہ جلووں کے بہتے ہوئے خشک دھارے
وہ نمکین آغاز شب اللہ اللہ
نمائش کی وہ تاب و تب اللہ اللہ
وہ بابِ مزمل پہ جشنِ چراغاں
فلک پر ہوں جیسے ستارے درخشاں

فضاؤں میں گونجے ہوئے وہ ترانے
وہ جاں بخش نغمے وہ پُرلطف گانے

وہ ہر سمت حُسن و لطافت کی جائیں
وہ آراستہ صاف ستھری دُکانیں

کہیں پر ہے نظّارہ کاریگری کا
کہیں گرم ہوٹل ہے "پیشاوری" کا

بقدرِ سکوں وہ دلوں کا بہلنا
امیروں غریبوں کا یک جا ٹہلنا

نمایاں نمایاں وہ یارانِ کالج
وہ عشرت بداماں جوانانِ کالج

کوئی تیز دستی و چستی پہ نازاں
کوئی صحت و تندرستی پہ نازاں

کوئی حسن کی جلوہ ریزی پہ مائل
کوئی شوخ نظروں کی تیزی پہ مائل

اِدھر چشم حیراں کی نظارہ سازی
اُدھر حسن والوں کی جلوہ طرازی

خراماں خراماں وہ ہمجولیوں میں
نکلتی ہوئی مختلف ٹولیوں میں
نقابوں میں وہ بے نقابی کا عالم
جو لاتا ہے دل پر خرابی کا عالم
کسی کا وہ چہرے سے آنچل اٹھانا
کسی کا کسی سے نگاہیں چرانا
کبھی یک بہ یک چلتے چلتے ٹھہرنا
نگاہوں سے جلووں کی اصلاح کرنا
کبھی اک توجّہ دکانوں کی جانب
کبھی اک نظر نوجوانوں کی جانب
تماشا غرض کامیاب آ رہا تھا
نمائش پہ گویا شباب آ رہا تھا
ادھر ہم بھی بزمِ تخیّل سجا کر
کھڑے ہو گئے ایک دوکاں پہ آ کر
نظر مل گئی دفعتاً اک نظر سے
دھڑکنے لگا دل محبّت کے ڈر سے

ادھر تو نظر سے جبیں سائیاں تھیں
اُدھر سے بھی کچھ ہمّت افزائیاں تھیں
خلش کوئی دونوں کو تڑپا گئی تھی
محبّت کی منزل قریب آگئی تھی
خیالات میں اس طرف اِک تلاطُم
لبوں پر اُدھر ہلکا ہلکا تبسّم
نگاہوں سے عہدِ وفا ہو رہا تھا
اشاروں میں مطلب ادا ہو رہا تھا
اِدھر عشق کے بام و در سج رہے تھے
گھڑی میں جو دیکھا تو نو[1] بج رہے تھے
یکایک جواں[2] کچھ مرے پاس آئے
جو تھے آستینوں پہ بلّے لگائے
کہا اتنی تکلیف فرمایئے گا!
نمائش سے تشریف لے جایئے گا
غرض چل دئے گھر کو مجبور ہو کر
محبّت کے جلووں سے معمور ہو کر

---

[1] نو بجے کے بعد طلبہ کے لئے سیرِ نمائش ممنوع ہو جاتی ہے [2] جواں سے مراد یونیورسٹی کے پراکٹوریل انیپرس ہیں

ہوئی جا رہی تھی عجیب حالتِ دل
کوئی چھین لے جیسے پڑھتے ہیں ناول

ہم اس طرح باب مزمل سے نکلے
لہو جیسے ٹوٹے ہوئے دل سے نکلے

بہر حال اب بھی وہی ہے نمائش
نوید طرب دے رہی ہے نمائش

وہی جشن ہے اور وہی زندگی ہے
مگر جیسے ہر شے میں کوئی کمی ہے

ارے او نگاہوں پہ چھا جانے والی
مرے دل کو رہ رہ کے یاد آنے والی

تری طرح جلوہ نما ہے نمائش
ترے حسن کا آئینہ ہے نمائش

نمائش میں تیری لطافت ہے پنہاں
نمائش میں تیری نزاکت ہے پنہاں

نگاہوں کو ناحق تری جستجو ہے
یقیناً نمائش کے پردے میں تو ہے

ترقیٔ معکوس

کالج میں دوسرا گھنٹہ

کس شان سے آیا ہے ترقی کا زمانہ
ہر تلخ حقیقت نظر آتی ہے فسانہ
تہذیب کے لٹتے ہوئے ساماں ہیں نظر میں
اخلاق کے گرتے ہوئے ایواں ہیں نظر میں
ہر اہل وفا رسم وفا چھوڑ رہا ہے
انسان ہی انسان کا دل توڑ رہا ہے
مصروف تعیش ہے جوانوں کی جوانی
ہیں اُن کے لئے خام جو باتیں ہیں پرانی
باتیں بھی نئی، دل بھی نیا، خود بھی نئے ہیں
یا لوگ انہیں یورپ سے یہاں چھوڑ گئے ہیں
ڈگری کے سوا اہلِ ہنر کچھ بھی نہیں ہیں
کہنے کو تو سب کچھ ہیں مگر کچھ بھی نہیں ہیں
مایوس کُن وقت ہے تعلیم کی حالت

ماتم کدہ علم ہے کالج کی عمارت

طاری ہے فضاؤں پہ سکوتِ غمِ ہستی
ہر اوج کے پردے میں نظر آتی ہے پستی

جو ذرّہ ہے وہ اپنی جگہ مہر بلب ہے
کالج کی عمارت ہے کہ ایوانِ طرب ہے

ایک ایسے ہی ایوان طرب کی ہے یہ تفسیر
ہے جس کی مری نظم کے اشعار میں تصویر

ماحول میں گونجی ہے لرزتی ہوئی آواز
اِک ختم ہوا دوسرے گھنٹہ کا ہے آغاز

کانوں سے ترقی کی صدا کھیل رہی ہے
آنکھوں سے زمانے کی ہوا کھیل رہی ہے

حوروں کے وہ جھرمٹ میں جوانوں کا نکلنا
بدمست نگاہوں کا وہ گر گر کے سنبھلنا

کمرے کو بنایا ہے چمن سینٹ کی بُو نے
ہیں قرب میں ہر رنگ کی ساڑی کے نمونے

درجہ ہے کہ بازیچۂ اربابِ محبّت

لکچر ہے کہ افسانۂ آداب محبت
اُستاد کے اِک سمت جوانوں کی وہ آہیں
اور دوسری جانب وہ ستم کوش نگاہیں
اک سمت وہ ہر سوٹ کی تزئین مکمل
اک سمت وہ شانوں پہ ڈھلکتے ہوئے آنچل
اِک سمت وہ ہر آنکھ کے مبہم سے اشارے
اِک سمت نگاہوں کے تجسّس میں نظارے
اِک سمت وہ اعلانِ مسرت کی بناوٹ
اک سمت وہ چہروں پہ محبت کی تراوٹ
اِک سمت وہ اظہارِ خوش اخلاقی ناکام
اِک سمت وہ ہلکا سا تبسّم پئے انعام
کوئی دلِ شیریں کسی فرہاد کی جانب
کیا خوف کہ نظریں تو ہیں استاد کی جانب
استاد کا یہ حال کہ بس گاتے ہیں اپنی
سُنتا ہی نہیں کوئی کہے جاتے ہیں اپنی
لکچر کسی پہلو سے اہم ہو تو بلا سے

مِنّت کش اَوراق و قلم ہو تو بلا سے
ہے صرف غرض حسن و نظر سے طلبا کو
روکے کوئی کس طرح ترقی کی وبا کو

کیا سیکھنے آئے ہیں یہ کیا سیکھ رہے ہیں
کچھ اپنے مضامیں سے جدا سیکھ رہے ہیں

جغرافیہ پڑھتے ہیں کسی کوئے حسیں کا
تاریخ سکھاتی ہے انھیں قصۂ لیلےٰ

ہے فلسفہ اِن کے لئے عنوان محبّت
اُردو کا سبق شرحِ گلستانِ محبّت

مضمونِ ریاضی میں بھی قابل ہیں یہ حضرات
با قاعدہ گنتے ہیں شب ہجر کے لمحات

ہندی کو سمجھتے ہیں یہ سجنی کے ترانے
تھی کس کو خبر ایسے بھی آئیں گے زمانے

یورش ہے جو ماحول پہ افکارِ رواں کی
درجے پہ مسلّط ہوئی جاتی ہے اُداسی
لب ہائے مدرس پہ ہے دُہرائی ہوئی بات

ہیں دوسرے گھنٹے کے گذرنے کی علامات
وہ لحظہ بہ لحظہ غم فرقت کا تصوّر
وہ خاتمہ درس محبت کا تصوّر
ہر سانس میں ہے جذبۂ خاموش کا عالم
اللہ رے ارباب جنوں کوشش کا عالم
سیری نہ ہوئی تھی ابھی رنگین فضا سے
دل ٹوٹ گیا تیسرے گھنٹہ کی صدا سے

زلزلہ

ایک شب ہلکی سی جنبش مجھے محسوس ہوئی
میں یہ سمجھا مرے شانوں کو ہلاتا ہے کوئی
آنکھ اٹھائی تو یہ دیکھا کہ زمیں ہلتی ہے
جس جگہ شے کوئی رکھی ہے وہیں ہلتی ہے
صحن و دیوار کو جنبش ہے تو در ہلتے ہیں
باہر آیا تو یہ دیکھا کہ شجر ہلتے ہیں

کوئی شے جنبش پیہم سے نہیں ہے محروم
ایک طاقت ہے پسِ پردہ مگر نامعلوم
چند لمحے بھی یہ نیرنگیٔ عالم نہ رہی
زلزلہ ختم ہوا جنبشِ پیہم نہ رہی
حیرتِ دید سے انگشت بدنداں تھا میں
شاہدِ جلوۂ قہاریٔ یزداں تھا میں
دفعتاً ایک صدا آہ و فغاں کی آئی
میرے اللہ گھڑی کس پہ مصیبت لائی؟
گُل کیا زلزلۂ قہر نے کس گھر کا چراغ
کس پہ ڈھایا یہ ستم کس کو دیا ہجر کا داغ
جا کے نزدیک یہ نظارۂ حیراں دیکھا
ایک حسینہ کو بصد حال پریشاں دیکھا
بیضوی شکل میں تھے حُسن کے جلوے پنہاں
آنکھ میں سحر بھرا تھا مگر آنسو تھے رواں
میں نے گھبرا کے یہ پُوچھا کہ یہ حالت کیوں ہے
تیری ہستی ہدفِ رنج و مُصیبت کیوں ہے

بولی اے شاعرِ رنگین طبیعت مت پوچھ
روز و شب دل پہ گذرتی ہے قیامت مت پوچھ
لوگ دُنیا کے تری مجھ کو زمیں کہتے ہیں
اہلِ زر مجھ کو محبت میں حسیں کہتے ہیں
میں انہیں حُسن پرستوں کی ہوں تڑپائی ہوئی
تجھ سے کہنے کو یہ راز آئی ہوں گھبرائی ہوئی
زر پرستوں سے ہیں بد دل مری دُنیا کے غریب
ہیں گرفتارِ سلاسل مری دُنیا کے غریب
مجھ سے یہ تازہ بلائیں نہیں دیکھی جاتیں
ظالموں کی یہ جفائیں نہیں دیکھی جاتیں
چاہتی ہوں مرے عشاق میں کچھ فرق نہ ہو
سفنِ میں کشتیٔ احساس وفا غرق نہ ہو
ایک وہ جس کو میسر ہوں عمارات ونقیب
ایک وہ جس کو نہ ہو پھونس کا چھپر بھی نصیب
صاحبِ دولت و ذی رتبہ و زردار ہو ایک
بے نوا غمزدہ و بیکس و لاچار ہو ایک

ایک مختار ہو اور نگ جہانبانی کا
اِک مرقع ہو غم و رنج و پریشانی کا

سخت نفرت ہے مجھے اپنے پرستاروں سے
چھین لیتے ہیں مجھے میرے طلبگاروں سے

چہرہ دستی کا مٹا دیتی ہیں سب جاہ و جلال
حیف صد حیف کہ حائل ہے غریبوں کا خیال

یہ نہ ہوتے تو دکھائی میں قیامت کا سماں
یہ نہ ہوتے تو مٹاتی میں غرورِ انساں

ایک کروٹ میں بدل دیتی نظامِ عالم
اِک اشارے ہی میں ہو جاتی یہ محفل برہم

اک تبسم سے جہاں برق بداماں ہوتا
نہ یہ آرائشیں ہوتیں نہ یہ ساماں ہوتا

ہر ادا پوچھتی سرمایہ پرستوں کے مزاج
کچھ تو فرمائیے حضرت کہ ہیں کس حال میں آج؟

لکھ پتی سنکھ پتی بے سروساماں ہوتے
جان بچ جائے بس اس بات کے خواہاں ہوتے

برسرِ خاک نظر آتے قصور و ایواں
اشک خونیں سے مرے اور بھی اُٹھتے طوفاں
میرے آغوش میں سب اہلِ ستم آجاتے
میرے برتاؤ سے بس ناک میں دم آجاتے
بعض کے منہ غم و آلام سے کالے کرتی
بعض کو موت کی دیوی کے حوالے کرتی
خون زردار ہی مزدور کی مزدوری ہے
میں جو خاموش ہوں یہ باعثِ مجبوری ہے
میرے آغوش میں جابر بھی ہیں مجبور بھی ہیں
میرے دامن ہی سے وابستہ یہ مزدور بھی ہیں
ضبط کرتی ہوں جو غم آتا ہے سہہ جاتی ہوں
جوش آتا ہے مگر کانپ کے رہ جاتی ہوں

شبِ رنگین

فضاؤں پر خوشی چھائی ہوئی تھی

محبت جوش میں آئی ہوئی تھی
نظر پیغام عشرت دے رہی تھی
تمنّا کروٹیں سی لے رہی تھی
تعیّن کی کھلی جاتی تھیں راہیں
پریشاں تھیں ستاروں کی نگاہیں
سکوتِ شب طلسم رنگ و بو تھا
ترنم ہی ترنم چار سُو تھا
چھڑا جاتا تھا ہر نایاب نغمہ
ہوا جاتا تھا خود بیتاب نغمہ
بڑی دلکش صدائیں آ رہی تھیں
مسلسل رُوح کو تڑپا رہی تھیں
اُمید دل پر مسلّط تھی جوانی
اُمنگوں پر تھی غالب ناتوانی
تجلّی زیر مستی کے اثر سے
اُٹھا جاتا تھا ہر پردہ نظر سے
وہ ہر نظّارہ بیتابِ محبّت

وہ دستِ دل میں مضرابِ محبّت
وہ کیفیات سے معمور ہستی
الٰہی جنشِ اُلفت اِتنی مستی
معطّر تھی فضائے شادمانی
نمایاں تھا نشاطِ کامرانی
ہر اک ذرّہ سے عریاں تھی جوانی
چھلکتی تھی شرابِ ارغوانی
حصُول مدّعا سے شاد تھا میں
تمام افکار سے آزاد تھا میں
مرا دل ہمسرِ گنگ و جمن تھا
مرے سینے میں دریا موجزن تھا
شکیبائی کا دامن چھٹ رہا تھا
محبّت کا خزانہ لُٹ رہا تھا
جمالِ ہم نشیں پیشِ نظر تھا
مرا دل ماسوا سے بے خبر تھا
وہ اِک شوقِ فراواں دونوں جانب

وہ اِک احساسِ پنہاں دونوں جانب
اِدھر ہر ہر نفس وقفِ دعا تھا
اُدھر بابِ قبولیت کھلا تھا
اِدھر پاکیزہ جذباتِ محبّت
اُدھر پیہم مداراتِ محبّت
اِدھر اِک خود فراموشی کا عالم
اُدھر ہونٹوں پہ خاموشی کا عالم
اِدھر اِک رُعب سا چھایا ہوا تھا
اُدھر چہرے پہ رنگ آیا ہوا تھا
رُخِ پُرنُور کی وہ جگمگاہٹ
لبوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ
تبسّم اور قیامت کا تبسّم
وہ معصومانہ اندازِ تکلّم!
وہ سامانِ سکونِ زندگانی!
وہ اظہارِ کمالِ مہربانی
سراپا پیکرِ خلق و محبّت

مجسّم سادگی و نیک خصلت
اُدھر وہ حاصل حُسن دو عالم
اِدھر میں کامیاب سعئ پیہم
مسلّط مجھ پہ مدہوشی تھی لیکن
لبوں پر مُہر خاموشی تھی لیکن
خدا جانے میں کیا کیا کہہ رہا تھا
کوئی لفظوں کا دریا بہہ رہا تھا
فلک پر چاند تارے سن رہے تھے
سکوتِ شب کے مارے سُن رہے تھے
نیاز و ناز کا دل سن رہا تھا
چراغِ صبح محفل سن رہا تھا
اذانوں کی صدائیں آ رہی تھیں
دعائیں دل سے مانگی جا رہی تھیں
عبادت میں خلل نہ آئے یا ربّ
قیامت تک رہے باقی یہی شب
مگر یہ التجائیں کون سُنتا

غریبوں کی دعائیں کون سنتا

نمودِ مہرِ عالمتاب توبہ

ہوا منظر کا منظر خواب توبہ

وہی رُوداد شب یاد آرہی ہے

جو باقی تھی وہ اب یاد آرہی ہے

کہاں ہے آجا

راحتِ بندۂ بے دام کہاں ہے آجا

پیکرِ حسن سرِ بام کہاں ہے آجا

رونقِ بزمِ مے و جام کہاں ہے آجا

زینتِ جلوہ گہِ عام کہاں ہے آجا

اے امیدِ دلِ ناکام کہاں ہے آجا

تیری فرقت خللِ اندازِ سکونِ پیہم !

تیری فرقت دلِ مایوس پہ اک طرفہ ستم

تیری فرقت سببِ کاوش و بیداریٔ غم

تیری فرقت سے ہے شیرازہ ہستی برہم
تو نہیں ہے تو پھر آرام کہاں ہے آجا
شاہد دورِ سیہ بختت و شب تار ہوں میں
خوگر نالہ و لذت کشِ آزار ہوں میں
دامِ طوفانِ حوادث میں گرفتار ہوں میں
روز و شب منتظرِ دیدِ رُخِ یار ہوں میں
دل وقفِ غم و آلام کہاں ہے آجا
شعلہ برکف ہے گلِ داغِ جگر تیرے بغیر
خار بر دوش ہے دامانِ نظر تیرے بغیر
خوں فشاں ہے شبِ غم دیدۂ تر تیرے بغیر
چین آتا ہے نہیں شام و سحر تیرے بغیر
منتظر ہوں سحر و شام کہاں ہے آجا
دورِ تاریکیٔ غم سے شبِ تنہائی سے
دم بدم جوش جنوں کی ستم آرائی سے
کعبہ و دیر و کلیسا کی جبیں سائی سے
خوفِ مجبوری و ناکامی و رسوائی سے

عشق ہے لرزہ بر اندام کہاں ہے آجا
منتشر ہونے لگی انجمن نازِ حیات
بن گیا خواب ہر اک منظرِ آغازِ حیات
دم شکستہ سا نظر آنے لگا سازِ حیات
اب کوئی دم میں ہوا جاتا ہے وا رازِ حیات
آگیا نزع کا ہنگام کہاں ہے آجا

مجھے بھول جا

مرے ساقیا، مجھے بھول جا!
مرے دلربا، مجھے بھول جا!
نہ وہ دل رہا نہ وہ جی رہا
نہ وہ دورِ عیش و خوشی رہا
نہ وہ ربط و ضبطِ دلی رہا
نہ وہ اوجِ تشنہ لبی رہا
نہ وہ ذوقِ بادہ کشی رہا

نہ وہ شغل شیشہ گری رہا

مَیں الم نواز ہوں آج کل
مَیں شکستہ ساز ہوں آج کل
میں سراپا راز ہوں آج کل
مجھے اب خیال میں بھی نہ لا
مجھے بھُول جا مجھے بھول جا

مجھے زندگی سے عزیز تر
فقط ایک تیری ہی ذات تھی
تری ہر نگاہ مرے لئے
سبب سکونِ حیات تھی
مری داستان وفا کبھی
تری شرح حسُن صفات تھی
مگر اب تو رنگ ہی اَور ہے
نہ وہ طرز ہے نہ وہ طور ہے
یہ ستم بھی قابلِ غور ہے

تجھے اپنے حسن کا واسطہ
مجھے بھول جا، مجھے بھول جا

قسم اضطراب حیات کی
مجھے خامشی میں قرار ہے
مرے صحن گلشنِ عشق میں
نہ خزاں ہے اب نہ بہار ہے
یہی دل تھا رونق انجمن
یہی دل چراغ مزار ہے
مجھے اب سکونِ دگر نہ دے
مجھے اب نوید سحر نہ دے
مجھے اب فریب نظر نہ دے
نہ ہو وہم عشق میں مبتلا
مجھے بھول جا، مجھے بھول جا!

چاند کی زبانی

بیگانہ ہو کے بزمِ جہاں دیکھتا ہوں میں
دُنیائے رنگ و بُو کا سماں دیکھتا ہوں میں

انسان کو پستیوں میں نہاں دیکھتا ہوں میں
اتنا بلند ہو کے جہاں دیکھتا ہوں میں

روشن ضمیر جیسے کوئی صرفِ دید ہو
یوں جلوہ ہائے کون و مکاں دیکھتا ہوں میں

میری نظر سے لاکھ زمانے گُزر گئے
ہر شعبۂ طلسمِ جہاں دیکھتا ہوں میں

انساں کی مرگ و زیست ہے پھولوں کی مرگ و زیست
عہدِ بہار و دورِ خزاں دیکھتا ہوں میں

پیشِ نظر مناظرِ فطرت نگار ہیں
دشت و جبال و آبِ رواں دیکھتا ہوں میں

یہ حُسنِ نظم و نسق یہ تشکیل کائنات

معراجِ فکر فلسفہ داں دیکھتا ہوں میں

عمرِ جہاں طویل، تو میری طویل تر
ہر ایک نسلِ اہلِ جہاں دیکھتا ہوں میں

سب کچھ نگاہ میں ہے مگر آہ کیا کہوں
برہمِ نظامِ بزمِ جہاں دیکھتا ہوں میں

عالم ہے نذرِ آتشِ حرص و ہوس تمام
اُڑتا ہوا فضا میں دھواں دیکھتا ہوں میں

ارزاں ہے ظلم و جور کی اُفتادگی مگر
جنسِ وفا و مہر گراں دیکھتا ہوں میں

اک سمت جشنِ شادی و ہنگامۂ نشاط
اِک سمت حشرِ آہ و فغاں دیکھتا ہوں میں

کاہل وجود و بے عمل و بے اُصول ہے
ہندوستاں میں جس کو جواں دیکھتا ہوں میں

شرحِ الم دراز ہے القصّہ اے شکیلؔ
اک داغ اپنے دِل میں نہاں دیکھتا ہوں میں

رقاصۂ حیات سے

پھولوں پہ رقص کر نہ بہاروں پہ رقص کر
گلزارِ ہست و بود میں خاروں پہ رقص کر

ہو کر جمودِ گلشنِ جنت سے بے نیاز
دوزخ کے بے پناہ شراروں پہ رقص کر

شمعِ سحر، فسونِ تبسّم، حیاتِ گل
فطرت کے ان عجیب نظاروں پہ رقص کر

تنظیمِ کائنات جنوں کی ہنسی اُڑا
اُجڑے ہوئے چمن کی بہاروں پہ رقص کر

سہمی ہوئی صدائے دلِ ناتواں نہ سُن
بہکی ہوئی نظر کے اشاروں پہ رقص کر

جو مر کے جی رہے ہیں تجھے اُن سے کیا غرض
تو اپنے عاشقوں کے مزاروں پہ رقص کر

ہر ہر ادا ہو رُوح کی گہرائیوں میں گُم

یوں رنگ و بو کی راہگذاروں پہ رقص کر
تو اپنی دھن میں مست ہے تجھ کو بتائے کون
تیری زمیں فلک ہے ستاروں پہ رقص کر
اِس طرح رقص کر کہ سراپا اثر ہو تو
کوئی نظر اٹھائے تو پیشِ نظر ہو تو

محبّت

بزمِ ہستی میں مسرت کے سزاوار تھے ہم
زینتِ انجمن و وقفِ دربار تھے ہم
سر بسر محرمِ گنجینۂ اسرار تھے ہم
آہ وہ دن کہ محبت کے پرستار تھے ہم

زیست کو زیست سمجھ کر ہی جیا کرتے تھے
عشرت و کیف کی تجدید کیا کرتے تھے
روز ان مست نگاہوں سے پیا کرتے تھے
دور از تفرقۂ زاہد و مے خوار تھے ہم

اُن کی محفل تھی جو سچ پوچھئے جنّت اپنی
اُن کی آشفتہ مزاجی تھی قیامت اپنی
اُن کی یاد اُن کا تصوّر تھی عبادت اپنی
رحمتیں جن پہ تصدّق وہ گنہگار تھے ہم

دل کو نیرنگیٔ عالم سے علاقہ ہی نہ تھا
انقلابات کا احساس گوارا ہی نہ تھا
اُن کے سودے کے علاوہ کوئی سودا ہی نہ تھا
جنسِ الطافِ محبّت کے خریدار تھے ہم

اپنا افسانہ تھا دُنیا کے فسانے سے جُدا
نیرِ ادراک تھا ہستی کے نشانے سے جُدا
تھی روش اپنی مگر سارے زمانے سے جُدا
دل سے اس رنگِ جُدائی کے طرفدار تھے ہم

کیا خبر تھی کہ دُکھے دِل کی صدا بھی کچھ ہے
کیا خبر تھی کہ زمانے کی ہوا بھی کچھ ہے
کیا خبر تھی کہ محبت کے سوا بھی کچھ ہے
اِس قدر اُن کی محبت میں گرفتار تھے ہم

دل زمینوں کا خبر کیا تھی دھڑک اُٹھے گا
شجرِ دہر کا ہر پتہ کھڑک اُٹھے گا
آسمان آگ کے شعلوں سے بھڑک اُٹھے گا
جادۂ شوق میں بیگانۂ رفتار تھے ہم

کس کو تھا علم کہ دولت سے ہے پستی کا فروغ
تلخیٔ بادہ عشرت سے ہے مستی کا فروغ
ہم تو سمجھے تھے محبت سے ہے ہستی کا فروغ
مرکزِ دل پہ رواں صورتِ پرکار تھے ہم

کیا خبر تھی کہ وہ یوں رنگ بدل جائیں گے
سرحدِ مہر و مروت سے نکل جائیں گے
صورتِ امن و اماں عہد بھی ٹل جائیں گے
سر بہ سر معتقدِ وعدۂ و اقرار تھے ہم

گلشنِ دہر کی خوں ریز فضاؤں کی قسم
دیو پیکار کی پُر ہول صداؤں کی قسم
حسن ظالم کی جنوں کوش جفاؤں کی قسم
آج تک بے خبرِ عالمِ اظہار تھے ہم

گو اٹھانا ہی پڑا ہجر میں داغِ ہستی
لیکن اونچا ہی رہا یوں بھی دماغ ہستی
پا گئے اُن کی بدولت ہی سراغ ہستی
جتنے مجبور تھے ہم اتنے ہی مختار تھے ہم

بزم ہستی میں پتہ دل کا محبّت نے دیا
مژدہ نزدیکی منزل کا محبّت نے دیا
درس آزادی کامل کا محبّت نے دیا
یوں بھی آزادئ کامل کے طلبگار تھے ہم

ہچکیاں لینے لگی اب تو غلامی پیہم
کھا رہی ہے نگۂ ناز جوانی کی قسم
یہ محبت کی نوازش ہے محبّت کا کرم
جیسے آغاز محبّت ہی سے بیدار تھے ہم

علی گڑھ چھوڑنے کے بعد

ہم نشیں رات کی مغموم خموشی میں مجھے

دُور کچھ دھیمی سی نغموں کی صدا آتی ہے
جیسے جاتی ہوئی افسردہ جوانی کی پکار
جس کو سُن سُن کے مری رُوح لرز جاتی ہے
جیسے گھٹتی ہوئی موجوں کا اُترتا ہوا شور
مطربہ جیسے کوئی دُور نکل جاتی ہے
یا ہواؤں کا ترنّم کسی ویرانے میں
جیسے تنہائی میں دوشیزہ کوئی گاتی ہے
میں بہت غور سے نغمات سنا کرتا ہوں
سچ تو یہ ہے کہ مری جان پہ بن جاتی ہے
بارہا اُٹھ کے میں جاتا ہوں صداؤں کی طرف
لیکن اک شے ہے جو واپس مجھے لے آتی ہے
چونک اُٹھتا ہوں جب اس خواب سے حیراں ہو کر
پھر مجھے دوسری دُنیا ہی نظر آتی ہے
آہ وہ بھوک کے مارے ہوئے افرادِ حزیں
جن کی صُورت پہ قناعت بھی ترس کھاتی ہے
جیسے اُجڑی ہوئی محفل کے کچھ افسردہ چراغ

روشنی میں جنہیں ہر گام پہ ٹھکراتی ہے
آہ وہ حضرتِ انساں ہی کی رُوداد ستم
جس کا اظہار بھی کرتے ہوئے شرم آتی ہے
وہ ترانے جو سُنا کرتا ہوں تنہائی میں
اُن ترانوں میں مجھے بُوئے وفا آتی ہے
گاؤں گا نغمے وہ تعمیرِ محبت کے لئے
میکدہ چھوڑ دیا جن کی اشاعت کے لئے

اُن کی تصویر دیکھ کر

آج کیا ہے جو ملا شوخ نگاہوں کو قرار ؟
کیا ہوا حُسن کی معصوم حیاؤں کا وقار ؟
آج کیوں تم مجھے دیکھے ہی چلے جاتے ہو؟
دفعتاً ٹوٹ گیا کِس لئے بجتا ہوا ساز ؟
کیا ہوئے نغمے وہ اب کیوں نہیں آتی آواز؟
آج ہونٹوں پہ خموشی ہی خموشی کیوں ہے؟

خوب تدبیر نکالی ہے منانے کی مجھے
آتشِ سوزِ محبت میں جلانے کی مجھے
بھولے بھالے ہو تو دیدو مرے شکووں کا جواب؟

تم نے کیا پیشتر اپنا نہ بنایا مجھ کو؟
پھر یکایک نہ نگاہوں سے گرایا مجھ کو؟
یہ اگر جھوٹ ہے تو منہ سے کہو چپ کیوں ہو؟

تم نے کیا دل کو مرے درسِ محبت نہ دیا؟
اور پھر جان کے داغِ غمِ فرقت نہ دیا؟
یہ اگر جھوٹ ہے تو منہ سے کہو چپ کیوں ہو؟

تم نے کیا مجھ سے کسی قسم کا وعدا نہ کیا؟
ایسا وعدہ جو کبھی بھول کے ایفا نہ کیا؟
یہ اگر جھوٹ ہے تو منہ سے کہو چپ کیوں ہو؟

دے سکے تم نہ مرے ایک بھی شکوے کا جواب
اب میں سمجھا کہ ہے کیا راز؟ بداماں حجاب!
واقعی تم کو ندامت ہے جو خاموش ہو تم
یا کسی پردۂ تصویر میں روپوش ہو تم

سُورج

صبح دم آب و تاب سے نِکلا
ذرّے ذرّے کو روشنی بخشی
شاہدِ بزمِ رنگ و بو بن کر
غنچے غنچے کی آرزو بن کر
ظلمتوں کے حجاب سے نِکلا
پتے پتے کو زندگی بخشی

اپنی پہلی کرن کے شعلے سے
آگ سی آسماں پہ بھڑکا دی
جھونپڑوں سے نکل گئے دہقان
لگ گئے کاروبار میں انساں
اُڑ گئے طائر آشیانے سے
رقص کرنے لگی پھر آبادی

جاگ اٹھے نیم خواب ہنگامے
رُوح لہرا گئی فضاؤں میں
زندگی نے ربابِ غم چھیڑا
نغمۂ عشرت و الم چھیڑا
صورتوں نے بدل لئے جامے
مَوج گرم آ گئی ہواؤں میں

اَوج حسن و شباب کیا کہئے
جیسے کوئی حسین زہرہ جبیں
غیض سے ابروؤں پہ بل ڈالے
پھول کی پتیاں مسل ڈالے
قصّہ اضطراب کیا کہئے
فصلِ گلشن تڑپ نہ جائے کہیں

فطرتِ کبر و ناز کا عالم
جیسے اک نازنین دوشیزہ

اپنے عاشق سے روٹھ جاتی ہے
جان کر اس کو پھر ستاتی ہے
یا کوئی تشنہ لب کنیزِ حرم
آبِ نوریں سے بھر لے مشکیزہ

دھوپ میں کام کر رہے ہیں جو لوگ
آہ اُن کے عرق عرق چہرے
جیسے مجبور دل کی بیتابی
جیسے فاقہ زدوں کی بے خوابی
کھیتوں کھیتوں گذر رہے ہیں جو لوگ
اُن پہ قرباں ہیں نور کے سہرے

آ گئی شام یعنی وقتِ زوال
ہے فضاؤں پہ خامشی طاری
خون ہی خون ہے نگاہوں میں
قتل کتنے ہوئے ہیں راہوں میں

ایک ظالم کی زندگی کا مآل
سربسر غیرت و نگوں ساری

تاکجا اے مُرقع تنویر
سلسلہ جور ناگہانی کا
فرق اِتنا ہے اوج و پستی میں
جس قدر نیستی و ہستی میں
ہے یہ انجام حُسن عالمگیر
ماحصل دیکھئے جوانی کا
اوج پاکر شباب ڈوب گیا
لیجیے آفتاب ڈُوب گیا

یاد ایامے

آغاز محبت میں اکثر وہ دَور بھی آیا کرتے تھے
میں اُن میں سمایا کرتا تھا وہ مجھ میں سمایا کرتے تھے

جب جور و ستم کے چہرے پر تھا لطف و عنایت کا غازہ
جب دل کو بھی کرنا مشکل تھا جذبات دروں کا اندازہ
جب پھول سے نازک دل پہ مرے تھا زخم نظر تازہ تازہ
اک بار تبسم فرما کر سو بار ہنسایا کرتے تھے

احساس کی شمعیں جلتی تھیں جب ناز و ادا کی محفل میں
رکھا تھا قدم مدہوشی نے جب ہوش و خرد کی منزل میں
جب فتح محبت پر اپنی مغرور تھے ہم دل ہی دل میں
وہ اور نظر کی شہ دے کر مغرور بنایا کرتے تھے

ہیں یاد ابھی تک دل کو مرے ان کی وہ عنایات پیہم
ہر لمحہ وہ احساسات وفا ہر لحظہ وہ صد انداز کرم
وہ عشق و تمنا کی دنیا وہ حسن و محبت کا عالم
جھکتی تھی نظر سجدے کے لئے جب سامنے آیا کرتے تھے

درپیش ہو درد ہجر کبھی جب غم کا تقاضا ہوتا تھا
اس دور جدائی میں کس کو پھر صبر کا یارا ہوتا تھا
یوں گرمیٔ ربط باہم سے فرقت کا مداوا ہوتا تھا
ملنے کو خود آیا کرتے تھے یا مجھ کو بلایا کرتے تھے

انجم کی جھلک اختر کی ضیا راتوں کو منور کرتی تھی
پھولوں کی مہک غنچوں کی ادا ہستی کو معطر کرتی تھی
سازوں کی جھنک نغموں کی صدا عالم کو مسحر کرتی تھی
نغمات حسیں سے ہم دونوں فطرت کو جگایا کرتے تھے

بھولوں گا نہ بھولا ہوں اب تک رخصت کا غم آگیں افسانا
منہ پھیر کے میری جانب سے آنکھوں میں وہ آنسو بھر لانا
پھر خود ہی دبی آواز سے کچھ تسکین کے جملے فرمانا
سو حشر بھی ہوں جس پر قرباں وہ حشر اٹھایا کرتے تھے

بیتاب جدائی میں ان کی جب اپنی طبیعت ہوتی تھی
کچھ ان کے خطوط رنگیں سے تسکین محبت ہوتی تھی
آنکھوں کو دلاسے دے دے کر پوشیدہ وہ صورت ہوتی تھی
تصویر کو فرط شوق میں ہم سینہ سے لگایا کرتے تھے

ہوتی تھیں ملاقاتیں ان سے جاڑوں کی ٹھٹھرتی راتوں میں
وہ بات کہاں فصل گل میں وہ لطف کہاں برساتوں میں
اک بار نہیں ہر بار سحر ہو جاتی تھی باتوں باتوں میں
تصدیق محبت کا عالم دنیا کو دکھایا کرتے تھے

ہے یاد حضور دل اور گُل وہ شکر ادا کرنا باہم
نظروں سے ملا کر نظروں کو وہ عہد وفا کرنا باہم
تکمیل محبت کی خاطر اٹھ اٹھ کے دُعا کرنا باہم
تاثیر بلائیں لیتی تھی جب ہاتھ اُٹھایا کرتے تھے
ہاں اب یہ حقیقت ہی نہ رہی ہاں اب یہ فسانہ ہی نہ رہا
ہر چند وہی ہیں ہم دونوں لیکن وہ زمانہ ہی نہ رہا

عہدِ وفا

چراغِ بزمِ تمنّا بجھا نہیں سکتا
میں بھول کر یہ قیامت اُٹھا نہیں سکتا
نشاطِ راحتِ ہستی مٹا نہیں سکتا
تمام عمر میں تجھ کو بُھلا نہیں سکتا
ترا خیال مرے دل سے جا نہیں سکتا
یہی تو باعثِ ضبطِ فغاں ہے میرے لئے
یہی تو حاصلِ عمرِ رواں ہے میرے لئے

یہی تو زندگی جاوداں ہے میرے لئے
یہی تو دولتِ کون ومکاں ہے میرے لئے
ترا خیال مرے دل سے جا نہیں سکتا

شریکِ بزمِ نشاط آفریں رہوں لیکن
اسیرِ دامِ غمِ آتشیں رہوں لیکن
وطن سے دور کہ خانہ نشیں رہوں لیکن
کسی مقام پر جاؤں کہیں رہوں لیکن
ترا خیال مرے دل سے جا نہیں سکتا

نشاطِ رُوح وہ آوازِ ساز بھی نہ رہے
رُبابِ عشق میں سوز وگداز بھی نہ رہے
غم و خوشی کا مجھے امتیاز بھی نہ رہے
نگاہِ ناز اگر دل نواز بھی نہ رہے
ترا خیال مرے دل سے جا نہیں سکتا

فریب دے مجھے دُنیائی رنگ و بو بھی مگر
جنوں نواز ہے ذوقِ جستجو بھی مگر
بجائے اشک بہے آنکھ سے لہو بھی مگر

خدانخواستہ پھر جائے مجھ سے تو بھی مگر
ترا خیال مرے دل سے جا نہیں سکتا

نیاز و ناز کا وہ ربط باہمی جائے
دلِ حزیں سے نہ مشق جفا سہی جائے
سکون قلب و جگر، لطف زندگی جائے
وفورِ غم میں اگر جان بھی چلی جائے
ترا خیال مرے دل سے جا نہیں سکتا

ترے خیال میں اک سادگی برستی ہے
ترے خیال میں پوشیدہ کیف و مستی ہے
ترے خیال سے قائم سکون ہستی ہے
ترے خیال سے آباد دل کی بستی ہے
ترا خیال مرے دل سے جا نہیں سکتا

ساون کی گھٹائیں

ہم یاد کریں گے ..... تمہیں ..... ساون کی گھٹائیں

چھا جائے گی جب صحن گلستاں پہ جوانی
فرمائیں گے جب غنچہ و گل بادہ فشانی
جب نغمے بنتے جائینگے فطرت کی زبانی - ہم بزم تصوّر ہی کو آباد کرینگے . . . ہم یاد
ہم یاد کریں گے تمہیں . . . . . مخمور فضائیں . . . ساون کی گھٹائیں

آجائے گا جب عیش و مسرت کا زمانہ
بن جائے گی جب غم کی حقیقت بھی فسانہ
تو دیں کوئی چھیڑینگی جب آ آ کے ترانہ' بوندوں کے ترانوں سے ہی دل شاد کرینگے' ہم
ہم یاد کرینگے . . . . تمہیں . . . نغموں کی صدائیں' ساون کی گھٹائیں

جب دل میں سما جائے گی موسم کی لطافت
جب رنگ دکھائے گا ہر اندازِ محبت
جب زیست نظر آئیگی مصروفِ عبادت' ہم شکوہ ناکامی فریاد کرینگے . . . . ہم
ہم یاد کرینگے تمہیں . . . اوقاتِ دعائیں . . . ساون کی گھٹائیں

فصیح الملک داغ کے حضور میں

سخن وروں کی ولایت کا تاجدار ہے تو

خدا گواہ کہ یکتائے روزگار ہے تو
زباں کو ناز ہے تجھ پر کہ تیرے گھر کی ہے
وطن کو فخر ہے تجھ پر کہ سحر کار ہے تو
فلک پہ چاند ہے تیری بلندیوں کا گواہ
بہارِ حُسن کی تابندہ یادگار ہے تو
یہی مقام جسے تو نے زینتیں بخشیں
اُسی لٹے ہُوئے گلزار کی بہار ہے تو
جنابِ سائل و بیخود پہ اُٹھ رہی ہے نگاہ
نہاں ہے پھر بھی سر بزم آشکار ہے تو
ابھی نگاہ میں ہے شکل حضرت سیمابؔ
ابھی تو شاخِ نشیمن پہ نغمہ بار ہے تو
ابھی تو پیش نظر ہے شبیہ نوحؔ و دلیرؔ
ابھی ہماری محافل میں گرم کار ہے تو
ابھی بہت ہیں وہ اربابِ محترم جن کے
لطیف شستہ تکلّم سے آشکار ہے تو
مگر کچھ آج یہ محسوس ہو رہا ہے مجھے

کہ جیسے گوشۂ تربت میں بیقرار ہے تو

میں جانتا ہوں تری بیقراریوں کا سبب
نئے ادب کے تخیل سے اشکبار ہے تو

نہ وزن شعر نہ مطلب نہ قافیہ نہ ردیف
اسی خیال سے محروں تہ مزار ہے تو

اگر یہ سچ ہے تو تجھ کو یقیں دلاتے ہیں
ہمارے دیدۂ و دل کا فقط قرار ہے تو

یہ داغ داغ کی خاطر مٹا کے چھوڑینگے
نئے ادب کو فسانہ بنا کے چھوڑینگے

تعلیم

مکمل مقصدِ تخلیق انساں ہو نہیں سکتا
بغیر علم افشا رازِ پنہاں ہو نہیں سکتا
اسے انساں نہیں کہتے وہ انساں ہو نہیں سکتا
خود اپنی زندگی کا جس کو عرفاں ہو نہیں سکتا

ہلاکت آفریں ہر موج ہے بادِ جہالت کی
جہالت سے کبھی عالم گلستاں ہو نہیں سکتا

اگر تعلیم میں ہم کچھ ترقی کر نہیں سکتے
ترقی کا ہماری کوئی امکاں ہو نہیں سکتا

ہمیں احساس جب تک خود نہ ہوگا اپنی حالت کا
ہمارے حال کا بھی کوئی پرساں ہو نہیں سکتا

اٹھیں اٹھ کر نشاناتِ جہالت کو فنا کر دیں
گوارا اب تو بربادی کا ساماں ہو نہیں سکتا

اگر تعلیم کی مشکل پہ قابو پا نہیں سکتے
تو ہم سے کوئی مشکل کام آساں ہو نہیں سکتا

فروزاں اور کر دیں شمعِ تہذیب و تمدن کو
بغیر اس کے منور قصرِ امکاں ہو نہیں سکتا

حقیقت میں وجود اس کا نہ ہونے کے برابر ہے
جو ذرہ خود چمک کر ماہِ تاباں ہو نہیں سکتا

کریں آراستہ تہذیب سے ہم اپنی نسلوں کو
شکیل اس سے زیادہ کوئی احساں ہو نہیں سکتا

نوحۂ اقبال

ملک سخن کا تاجورِ حال اُٹھ گیا
دُنیا سے اہلِ علم کا اقبال اُٹھ گیا

مہرِ علومِ مغربِ اقصیٰ ہوا غروب
مشرق کا چاند نیّرِ اقبال اُٹھ گیا

اب ہائے ترجمانِ حقیقت کہیں کسے
حق آشنا بزرگ کہن سال اُٹھ گیا

نالاں ہے دورِ ماضی و مستقبل حیات
مسند نشین انجمن حال اُٹھ گیا

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا کہہ کے روئیے
دُنیا سے اعتبارِ مہ و سال اُٹھ گیا

تھا اس کی مثل کوئی نہ ہوگا اب اس کی مثل
وہ بے مثال حیف کہ امسال اُٹھ گیا

شاعر، ادیب، فلسفی، عارف، خدا شناس
مجموعۂ کمال تھا اقبال اُٹھ گیا

تھی اُس کی شاعری حدِ تخئیل سے بلند
گر کر زمینِ شعر کو پامال اُٹھ گیا

اُس کی خوشی کا راز تھا بیداریٔ حیات
خوش طبع، خوش مزاج، خوش اعمال اُٹھ گیا

تاریخِ انتقال رقم کیجئے شکیلؔ
بدرِ کمال و عزّت و اقبال اُٹھ گیا

۱۳۵۷ھ

نوحۂ فانی

جہاں والو یہ جورِ آسمانی دیکھتے جاؤ
مصیبت پر مصیبت ناگہانی دیکھتے جاؤ

نگاہوں سے جُدا ہیں آج فانی دیکھتے جاؤ
یہ اندازِ فریبِ زندگانی دیکھتے جاؤ

ستم ہے اہلِ احساس و بصیرت اٹھتے جاتے ہیں
متاعِ دیدہ و دل کی گرانی دیکھتے جاؤ

قمرؔ کی مرگِ غم آگیں کا منظر دیکھنے والو
فلک کی دوسری نامہربانی دیکھتے جاؤ

وہ شاعر جس کے منہ سے ہم یہ مصرع سنتے آئے تھے
"اب اٹھا چاہتی ہے نعشِ فانی دیکھتے جاؤ"

وہ شاعر جو بہت پُردرد لہجے میں یہ کہتا تھا
"کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ"

اُسی شاعر کو اب اک گوشۂ گلزارِ جنت میں
ہم آغوشِ حیاتِ جاودانی دیکھتے جاؤ

شکیلؔ انسان کی بعد فنا ہی قدر ہوتی ہے
بڑھے گا اور بھی اعزازِ فانی دیکھتے جاؤ

نوحۂ قمر بدایونی

شرحِ جفائے چرخ کہیں مختصر نہیں
کس گھر میں آج ماتمِ اہلِ ہنر نہیں

ہوتے ہیں انقلاب جہاں میں نئے نئے

رنگِ جہاں مگر کبھی نوعِ دگر نہیں
اپنا وجود اپنے عدم کی دلیل ہے
روداد مرگ و زیست پہ کس کی نظر نہیں
ہوتی ہے مرنے والوں کی مرنے کے بعد قدر
گو زندگی میں عزتِ اہلِ ہنر نہیں
ہے مجلس ادب صفِ ماتم بنی ہوئی
افسوس آج بزم سخن میں قمرؔ نہیں
وہ جس کا احترام تھا اطرافِ ہند میں
ہاں ہاں وہی جو بزم میں اب جلوہ گر نہیں
تھی اُس کی ذات نازشِ دنیائے شاعری
کچھ لطفِ شاعری ہی نہیں وہ اگر نہیں
داغِ غمِ قمرؔ سے کلیجہ ہے پاش پاش
جو مندمل ہو اُف یہ وہ زخمِ جگر نہیں
ہستی پہ اُن کی اہلِ بدایوں کو ناز تھا
کس انجمن میں ذکرِ وصالِ قمرؔ نہیں
نکلی سر اجل سے یہ تاریخ اے شکیلؔ
اہلِ سخن میں آج جنابِ قمرؔ نہیں
۱۳۵۹ + ۱ = ۱۳۶۰

شہیدؓ کربلا کی یاد میں

نظر وابستۂ ماہ محرم ہوتی جاتی ہے

سلامی بزم ہستی بزم ماتم ہوتی جاتی ہے

طبیعت خود بخود دلدادۂ غم ہوتی جاتی ہے

صدائے دل صدائے سوز ماتم ہوتی جاتی ہے

ہوائے دہر کی خونابہ افشانی ارے توبہ

خزاں برکف بہار بزم عالم ہوتی جاتی ہے

زمینِ کربلا کے آفت دہ ہیبت ناک نظارے

دلوں سے قدر محشر واقعی کم ہوتی جاتی ہے

حریفان علیؓ وعدہ خلافی کرتے جاتے ہیں

عداوت جزو خوئے ابن آدم ہوتی جاتی ہے

ستم بھی اور پھر بھوکے پیاسوں پر ستم توبہ

کلیجہ کانپتا ہے چشم پُرنم ہوتی جاتی ہے

مے کوثر پلاتے ہیں جناب مصطفےٰ شاید

علی اصغر کے رونے کی صدا کم ہوتی جاتی ہے